جہادِ کبیر

دین اسلام کی دو اہم اصطلاحات جو لفظی طور پر بھی قریب ہیں اور معنوی طور پر بھی' آج کل تمام حلقوں میں ہی بحث و گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ ہر طبقۂ فکر ان اصطلاحات کو اپنے ذوق اور خواہشات کے مطابق معنی پہنانے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ ان کے حقیقی معنی کیا ہیں' ظاہر ہے اس کے لیے قرآن وسنت کی اساسات کو پیش نظر رکھے بغیر کچھ بھی کہنا ناحق ہوگا۔ یہ دو اصطلاحات ہیں ''جہاد'' اور ''اجتہاد''۔

جہاد اور اجتہاد کا مادہ جہد ہے۔ عربی زبان کی درمیانی سی شد بد رکھنے والا شخص ان دو ابواب (مفاعلہ اور افتعال) کی مشترک اور متنوع خاصیات کے اعتبار سے ان الفاظ میں پائے جانے والے معنوی اشتراک اور اختلاف کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

جہاد کے معنی میں کسی قوت کے مقابلہ میں کوشش اور محنت کرنا نمایاں ہے۔ یہ قرآن کی وہ اصطلاح ہے جس کی اہمیت اور ضرورت پر خود بیشتر قرآن ہی دلیل ہے۔ یہ وہ تصوّرِ حیات اور جذبۂ عمل ہے جسے حیاتِ جاودانی کا باعث اور اللہ کی رضا و خوشنودی کا ضامن بتایا گیا ہے۔ کبھی یہ لفظ بغیر کسی صلہ اور اضافت کے لایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ زندگی کا وہ لائحہ عمل قرار پاتا ہے جو انسان کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھتے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کا ذریعہ ہے۔ ''عَلٰی'' کے صلہ سے کشمکش اور محنت کی بنیاد کی وضاحت ہوتی ہے ﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ ''ل'' کے صلہ کے ساتھ اس لفظ کا استعمال محنت اور جد و جہد کی غایت اور مقصد کو بیان کرتا ہے ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾۔ ''ل'' کا صلہ انسانی کاوش کی افادیت کے اُس پہلو کو مبرہن کرتا ہے جس کا اصل حاصل خود اُس کا اپنا ذاتی نفع ہے ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾۔ ''ب'' کے اضافے سے اللہ کے راستے میں کی جانے والی محنت کے ذرائع اور وسائل کو نمایاں کیا گیا ہے: ﴿اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اور ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا﴾۔ ''مع'' کا اضافہ اُن مخالف قوتوں کو بیان کرتا ہے جنہیں زیر کرنے اور جنہیں اللہ کے حکم کے تابع کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ یہی مفہوم بعض دفعہ بغیر کسی صلہ کے' کوئی مفعول بہٖ لا کر بھی پیدا کیا جاتا ہے: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ.....))۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''جہاد'' ایک ایسی دینی اصطلاح ہے جس کے ہر ہر پہلو کو ایسی صراحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے کہ طالع آزماؤں کے لیے کم ہی گنجائش چھوڑی گئی ہے۔ اس

کے باوجود بعض کوتاہ بین اس جامع اصطلاح کو محدود اور مقید کرنے کے درپے ہیں۔ جہاد کو ''قتال'' کے مستقل معنی پہنانا ڈھٹائی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟''

جہاد کی جتنی بھی اقسام قرآن وسنت میں بیان ہوتی ہیں' اُن میں سے ایک مخصوص قسم کو ''جہادِ کبیر'' قرار دیا گیا ہے' یعنی بڑا اور عظیم جہاد ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾۔ یہ خطاب خود شارع کا عطا کردہ ہے' کسی دوسرے کا نہیں۔ یہ جہاد قرآن کے علم وحکمت کی بنیاد پر اتمامِ حجت اور شہادت علی الناس کی مساعی سے عبارت ہے۔ کیسی بدقسمتی ہے کہ جہاد کی عسکری تعبیرات کے غلغلوں میں جہادِ کبیر کی اہمیت اور حیثیت بالکل ہی دب کر رہ گئی ہے۔ آج جب کہ فتنوں کا دور دورہ ہے' قتال فی سبیل اللہ کی اصل ذمہ دار قوتیں' یعنی ریاست وحکومت باطل کے سامنے سرنگوں ہیں.....' نصبِ امامت کی کوئی منظّم جدوجہد بھی اُس حتمی مرحلے میں داخل ہوتی نظر نہیں آتی کہ ملکِ عزیز میں قوت کے استعمال کی ناگزیریت پر دلیل قائم کی جاسکے...اور نہ ہی دینی' معاشرتی' عدالتی اور سیاسی حالات اُن معیارات پر ہیں کہ مجرد کافر وظالم حکمرانوں کے خلاف خروج پر حق پرست اہل علم کا اتفاق ہو سکے...نتیجتاً غیر منظّم اور غیر مستعد گروہوں نے اس عظیم ''خدمت'' کو خود اپنے سر لے لیا ہے اور تیر بے ہدف کی مانند انتشار وافتراق کا باعث بن رہے ہیں' اور اغیار واعداء اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے لیے عسکریت پسندی کے آزادانہ رجحانات کو خوب خوب استعمال کر رہے ہیں۔ کیا حق پرست اہل علم کو جہادِ کبیر کی جانب توجہ کرنے کے لیے زیادہ بڑے حادثوں کا انتظار ہے؟''

قرآن کی اصطلاح میں جہادِ کبیر اصلاً ''جہاد بالقرآن'' ہے۔ قرآن صرف نظری طور پر ہی سرچشمہ ہدایت نہیں ہے۔ یہ عقائد کی اصلاح کرتا ہے.....اُن معیارات پر جو خود خدا کے مقرر کردہ ہیں.....' اخلاق کی تطہیر کرتا ہے.....اُن زاویوں سے جو نبی ﷺ کی سنت وسیرت سے مستنبط ہیں.....اور نظریات کی صفائی کرتا ہے.....ایسے کہ عمل خود بخود صلاحت کے سانچے میں ڈھل جائے۔ ان مراحل کو سر کیے بغیر یا کم از کم ان محاذوں پر علم جہاد سر بلند کیے بغیر محض سیاسی وعسکری جدوجہد سے زیادہ سے زیادہ کیا حاصل کیا جاسکتا ہے! جہاد کا یہی وہ درجہ ہے جو دین کی دوسری اہم اصطلاح یعنی ''اجتہاد'' کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اجتہاد اُس مربوط علمی کاوش اور ذہنی وفکری عرق ریزی کو کہتے ہیں جسے بدلتے حالات میں نئے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے مصادرِ شریعت کی رہنمائی میں اہل علم سرانجام دیتے ہیں۔ ایک ترقی اور ارتقاء پذیر معاشرے کی ضرورت ہے کہ اُس میں علم وآگہی کے ذرائع ووسائل بھی ترقی پائیں۔ دین اسلام کی تعلیمات ہر دور اور ہر معاشرے کی اصلاح اور ترقی کی ضامن ہیں۔ قرآن کے الفاظ غیر مبدل ہیں۔ سنت وحدیث کی حجیت لازوال ہے۔ علم کے اس اتھاہ سمندر سے موتی بہرصورت نکالتے رہنا ہوگا اور ظلم وجہالت کی تاریکیوں کو وحیِ آسمانی کے نور سے مٹاتے رہنا ہوگا' کہ یہی اس ''خیر اُمت'' کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ شرط بس ایک ہی ہے.....جہادِ کبیر!oo

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب وتدوین: سید برہان علی۔ خالد محمود خضر

سُورۃ الحَج

سورۃ الحج ۱۰ رکوعوں اور ۷۸ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے مکی یا مدنی ہونے میں علماء کے مابین کچھ اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت کے مضامین کا بیشتر حصہ مکی سورتوں کے مضامین سے مشابہ ہے، لیکن اس میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ مدنی ہیں۔ میرا اپنا تأثر یہ ہے کہ یہ سورت دراصل مکی ہے، اس کے تمام مضامین اور اس کا پورا تانا بانا بالکل مکی سورتوں کے مشابہ ہے، البتہ اس کی بعض آیات جن کے مدنی ہونے کا گمان ہوتا ہے وہ مدنی نہیں بلکہ برزخی ہیں، یعنی مکہ سے مدینہ کے سفرِ ہجرت کے دوران نازل ہوئیں۔ ایک جانب مکہ کے حالات تھے جہاں لوگ رسول اللہ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے۔ وہاں سے حضور ﷺ کو جان بچا کر جس طرح بھی ممکن ہو سکا نکلنا پڑا۔ تین دن تک آپؐ غارِ ثور میں روپوش رہے۔ اس کے بعد بھی آپؐ کا تعاقب ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر آپؐ کو بچایا۔ دوسری جانب مدینہ منورہ کا حال یہ تھا کہ وہاں آپؐ کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور مدینہ میں آپؐ کا داخلہ بلا مبالغہ ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہوا۔ یہ حالات کا ایک عظیم الشان فرق تھا جو ہجرت کے نتیجہ میں واقع ہو رہا تھا۔ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اب جو تبدیلی حضور ﷺ کے طرزِ عمل میں پیدا ہونے والی تھی وہی ان آیات میں بیان ہوئی ہے اور میرے نزدیک ان کے نزول کا بہترین موقع سفرِ ہجرت ہی بنتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع میں بڑے پرجلال انداز میں ایمان بالآخرۃ کا ذکر ہوا ہے۔ ابتدائی آیات ہی لرزا دینے والی ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝﴾

''اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو' قیامت کا زلزلہ یقیناً بہت بڑی شے ہوگی۔''

اُس دن کی ہولناکی کا اندازہ کرنے کے لیے ایک تمثیل بیان کی گئی ہے:

﴿یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝﴾

''جس روز تم اسے دیکھو گے' ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی' ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا' اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔''

آپ کے علم میں ہے کہ رضاعت کا دَور ایک خاص دَور ہوتا ہے۔ اگرچہ ماں کی ممتا اور محبت تو بعد میں بھی ہوتی ہے اور ہمیشہ ہی رہتی ہے لیکن اس خصوصی دَور میں تو اس کا کوئی تصور ہی ممکن نہیں۔ صرف انسانوں کا ہی معاملہ نہیں بلکہ حیوان بھی اپنے دودھ پیتے بچوں کے ساتھ ایسی محبت اور شفقت رکھتے ہیں کہ ماں اپنے شیر خوار بچے کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ ایسا ہیبت ناک دن ہوگا کہ اُس روز دودھ پلانے والی مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی اور دہشت سے تمام حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے' اور اُس روز کی سختی کے اثرات سے لوگ مدہوش نظر آئیں گے۔

پھر فرمایا کہ انسانوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اُس کی صفات کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں (اس میں زیادہ اشارہ اللہ کی قدرت کے بارے میں ہے کہ جس کے ذریعے وہ تمام نوعِ انسانی کو دوبارہ پیدا کر کے جمع کرے گا) کٹ حجتیاں کرتے اور من گھڑت دلیلیں دیتے ہیں' حالانکہ نہ تو ان کے پاس کوئی راہنمائی اور ہدایت ہے اور نہ ہی کوئی روشن کتاب موجود ہے جس کی بنیاد پر وہ دلیل بازیاں کرتے ہیں۔ اگر ان کی زندگیوں' سیرت و کردار اور معاملات (جو کہ نہایت پست اور گھٹیا ہیں) کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرکش شیطان کے پیروکار ہیں' حالانکہ اُس شیطان کے بارے میں تو یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ جو کوئی بھی اس کو اپنا ساتھی بنائے گا تو وہ اس کو گمراہ کر کے جہنم کی آگ میں پہنچا کر رہے گا۔

ایمان بالآخرۃ کے ضمن میں اولاً خود انسان کی تخلیق سے استشہاد کیا گیا اور پھر مردہ زمین کی مثال دی گئی کہ تم دیکھتے ہو کہ بارش کے برسنے سے اس میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ پھر تم اس میں کیسے شک کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا؟

دوسرے رکوع کی پہلی آیت ہم سب کے لیے جو بعث بعد الموت کا اقرار کرتے ہیں' عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ ارشاد ہوا کہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں کنارے کنارے۔ (گویا ایک لفظ میں پوری صورت حال کی تصویر دے دی گئی۔) اگر خیر خیریت ہے' فائدہ پہنچ رہا

ہے‘ کوئی امتحان و آزمائش نہیں ہے تو بڑے آرام و اطمینان سے چلتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ابتلا آ جاتی ہے تو اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ یہ کیفیت دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے کا باعث ہے‘ اور یہی تو صریح خسارہ ہے۔ یہ درحقیقت منافقت کی ایک تعبیر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ شعوری منافقت ہو‘ بلکہ یہ غیر شعوری منافقت ہے‘ جو حقیقی اور قلبی منافقت ہے۔ مؤمن کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ جب اپنے آپ کو اللہ سے وابستہ کرے تو اس طور سے کہ ’’ہر چہ باداباد‘ ما کشتی در آب انداختیم!‘‘

حق و باطل کے مابین کشمکش کے ضمن میں آیت ۱۵ ایک اہم آیت ہے اور مشکلاتِ قرآن میں سے ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بیشتر لوگ اس میں سرگرداں رہے ہیں اور بہت کم لوگ اس کو سمجھ پائے ہیں۔ اس میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں مؤمن کا واحد سہارا اللہ کی مدد کی اُمید ہے‘ لیکن شیطان کے وسوسوں کے زیر اثر کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ اس امید کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کیفیت ہو جائے تو پھر انسان کے پاس کون سا سہارا رہ جاتا ہے؟ تو اس آیت میں دراصل یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنی اُمید کے رشتے کو کمزور نہ پڑنے دو‘ اُس کی مدد پر یقین رکھو‘ وہ آ کر رہے گی۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں آیا ہے کہ سفرِ ہجرت کے دوران آنحضورﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا تھا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾۔ یہ یقین ہو تو آدمی قائم رہے گا‘ ورنہ اس کے قدم اکھڑ جائیں گے اور وہ گر پڑے گا۔ اس کے لیے یہ تمثیل دی گئی ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ﴾

’’جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا اسے چاہیے کہ ذرا بلندی کی طرف ایک رسّی تان لے‘ پھر اس رسّی کو کاٹ دے‘ پھر ذرا دیکھے کہ اُس کی یہ تدبیر اس چیز کو رد کر سکتی ہے جو اسے ناگوار ہے؟‘‘

یعنی اللہ کی نصرت کی اُمید ہی ہماری آس ہے۔ یہی وہ حبل اللہ ہے جس کے ذریعے ہم اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اُسی کو منقطع کر دیں پھر تو ہمارے لیے کوئی سہارا رہے گا ہی نہیں۔ گویا پھر تو ہم آسمان سے زمین پر پٹخ دیے جائیں گے۔

آگے جا کر آیت ۳۱ میں ایک اور تمثیل بیان ہوئی ہے کہ جو شخص خدا کے ساتھ کسی کو شریک مقرر کرے تو وہ ایسا ہے گویا آسمان سے گر پڑے اور پھر اس کو پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا کا جھونکا اسے کسی دُور افتادہ جگہ پر پھینک دے۔ یعنی حالات کا ایک ریلا آئے گا اور اس کو بہا لے جائے گا۔ اس کے قدم جمے نہیں رہیں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کے تیسرے رکوع کے آخری حصہ سے پانچویں رکوع تک مناسکِ حج کا ذکر ہوا

ہے۔قرآن حکیم میں مناسک حج کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ایک سورۃ البقرۃ میں جو ہم پڑھ چکے ہیں اور دوسری مرتبہ اس سورۃ الحج میں۔ یہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ ؕ وَمَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾﴾

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی (روئے سخن قریش مکہ کی طرف ہے) اور جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے اور مسجد حرام سے روک رہے ہیں' جسے ہم نے یکساں (بلا امتیاز) تمام لوگوں کے لیے بنایا ہے' مقامی ہوں یا باہر سے آنے والے' (تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ) ہر اُس شخص کو جو اس (مسجد حرام) میں از راہِ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔''

یہاں اہل ایمان کی غیرت کو بھی للکارا جا رہا ہے کہ مشرکین نے تمہیں مسجد حرام میں داخلے اور حج وعمرہ سے روک دیا ہے اور تمہیں مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔اب تمہیں یہاں سے نکل کر ٹھنڈی چھاؤں یا گوشۂ عافیت میں جا کر بیٹھ نہیں رہنا ہے بلکہ اب تمہاری جدوجہد کا ایک نیا مرحلہ (phase) شروع ہونے والا ہے۔اب تمہیں توحید کے اس مرکز کو مشرکوں کے تسلط سے آزاد کرانا ہے۔ ؎

مسجد حرام کے بارے میں یہاں ایک عجیب بات فرمائی گئی ہے کہ اس میں ہم نے یہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کو بالکل برابر کر دیا ہے۔یہ نہایت اہم اعلان ہے' جس کی رو سے یہاں کے رہنے والوں کو باہر سے آنے والوں پر کوئی خصوصی اور امتیازی حق حاصل نہیں ہے۔یہ تمام اہل ایمان کے لیے ایک کھلا شہر (open city) ہے۔اس میں اگر کوئی قدغنیں لگائی جائیں گی تو وہ قرآن کی اس آیت کے خلاف ہوں گی۔اسی طرح وہاں پر جو کرائے وصول کیے جاتے ہیں وہ پرلے درجے کی حرام خوری ہے جو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ارشادِ نبویؐ کے مطابق ارضِ مکہ کا کرایہ حرام ہے۔اس لیے کہ وہاں تو لوگ بیت اللہ کی زیارت اور طواف کے لیے آتے ہیں جس کو آج کل ان لوگوں نے کمائی کا دھندا بنا رکھا ہے۔پھر اس گھر کی تعمیر کا مقصد بتایا گیا کہ یہ گھر توحید کا مرکز بنے اور یہاں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔جو لوگ بھی یہاں طواف' قیام اور رکوع وسجود کے لیے آئیں تو ان کی خاطر ہمارے گھر کو پاک وصاف رکھا جائے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا: ؎

﴿وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ .....﴾

یعنی لوگوں کو حج کے لیے پکارو تو وہ چلے آئیں گے پیدل بھی اور ہر اُس اونٹنی پر بھی جو طویل سفر کر کے دبلی ہو چکی ہوگی' ہر دور دراز مقام سے گہری کھائیوں کو عبور کرتے ہوئے آئیں گے اور ہمارا یہ گھر آباد رہے گا تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو ان کے لیے یہاں رکھے گئے ہیں اور وہ چند معین دنوں میں اللہ کا نام لیں ان

چوپایوں پر جو ہم نے انہیں عطا کیے ہیں۔

قربانی جو کہ مناسک حج کا ایک اہم جزو ہے اس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں نہیں آیا۔ اس سورت میں اس کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ آیا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اللہ تک نہ تو ان قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون' البتہ اگر تقویٰ ہے تو وہ پہنچ جاتا ہے۔

پانچویں رکوع کی آخری آیت اور چھٹے رکوع کی آیات میرے نزدیک برزخی آیات ہیں' جن میں ہجرت کے نتیجہ میں تبدیل ہو جانے والی صورتِ حال کی جانب اشارہ ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ●﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ مدافعت فرمائے گا اہل ایمان کی جانب سے۔ یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا۔''

ان خائنین کو جنہوں نے بیت اللہ کے متولی ہونے کے ناطے سے خیانت کی ہے اور جو ناقدرے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ اب سمجھ لیں کہ پانسہ پلٹنے والا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کی مدد کا سورج اب اہل ایمان کے لیے طلوع ہوگا۔ اس کے بعد وہ اہم آیت آئی ہے جس کے نتیجے میں مکی دور کا صبر محض (Passive Resistance) کا مرحلہ اب اقدام (Active Resistance) کے مرحلے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ فرمایا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ○ نِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ.....﴾

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی گئی' اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے جن کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے کہا ہمارا رب صرف اللہ ہے۔''

اس سے آگے انتہائی زوردار اور تاکیدی انداز میں فرمایا:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ■﴾

''اللہ تعالیٰ لازماً مدد کرے گا ان کی جو اُس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔''

اس سے اگلی آیت میں گویا ایک طرح کا منشور (manifesto) بیان کر دیا گیا کہ اب اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان مدینہ پہنچ کر جو ایک چھوٹی سی شہری ریاست قائم کرنے والے ہیں وہاں ان کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ہم زمین میں تمکن عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

سورۃ الحج کا آخری رکوع اس اعتبار سے بہت جامع ہے کہ ان چھ آیات میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ آ گیا ہے۔ پہلی چار آیات میں بڑے جامع انداز میں ایمان کی دعوتِ عمومی یعنی تمام بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ' توحید' اللہ کی صفاتِ کمال' نبوت و رسالت' بعث بعد الموت کو ماننے کی دعوت ہے۔ اس کے بعد دعوتِ خصوصی ہے ان لوگوں کے لیے جو پہلی دعوت کے ماننے کا اقرار کریں۔ یعنی یہ دعوتِ عمل ہے اُن کے لیے جو ایمان کا دعویٰ یا اقرار کریں۔

توحید کے حوالے سے مخاطبین کو ایک مکھی کی مثال دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم جن کو پوج رہے ہو ان کی بے بسی اور لاچارگی کا تو یہ عالم ہے کہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں چاہے مل جل کر زور لگا لیں۔ حتیٰ کہ اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس کو واپس نہیں لے سکتے ہیں۔ کتنے لاچار ہیں یہ معبود اور کتنے بے بس ہیں جو ان کو پوج رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کا اندازہ نہیں کر سکے جیسا کہ انہیں کرنا چاہیے تھا۔ یقیناً اللہ قوی اور عزیز ہے۔ رسالت کے حوالے سے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بھی اپنے ایلچی چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ چنانچہ یہ وحی اللہ سے جبرائیلؑ کو' اُن سے محمد رسول اللہ ﷺ کو اور پھر اُن کے ذریعے انسانوں کو منتقل ہوئی ہے۔

آخری دو آیات ہم سب اہل ایمان کے لیے اہم ترین ہیں۔ ان میں سے پہلی آیت میں چار فعل امر جمع ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞﴾

''اے اہل ایمان! رکوع کرو' سجدہ کرو' اپنے رب کی بندگی اور پرستش کرو اور اچھے کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

مجرد زبانی اقرار سے کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ مذکورہ بالا چار شرائط پوری نہ کی جائیں۔ اس سے بھی اہم تر بات آخری آیت میں بیان ہوئی ہے:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط .....﴾

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں (اس کام کے لیے) چن لیا ہے' اور دین کے بارے میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔ (قائم رہو) اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تا کہ رسولؐ تم پر گواہ ہوں اور تم نوعِ انسانی پر گواہ بنو۔ پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ (کی رسی) کو مضبوط پکڑ لو۔ وہی تمہارا کارساز ہے' سو کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!''

سورۃ المؤمنون

سورۃ المؤمنون چھ رکوع اور ایک سو اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورت کا بھی پہلا رکوع ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ اندازِ بیان اور مضامین سے معلوم ہوتا ہے اس کا نزول مکہ کا دورِ متوسط ہے جس وقت رسول اللہ ﷺ اور کفارِ مکہ کے درمیان سخت کشمکش برپا تھی۔ اس سورت کا مرکزی مضمون اتباعِ رسولؐ کی دعوت ہے اور پورے مضامین اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس سورت کے پہلے رکوع کا مضمون سورۃ الحج کی آخری آیت کے ساتھ بڑا مربوط ہے۔ وہاں بات ختم ہوئی تھی اقامتِ صلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ پر اور یہاں بات شروع ہو رہی ہے فلاح پانے والوں کے اوصاف سے جو نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے' لغو باتوں سے اعراض کرنے والے' زکوٰۃ کی ادائیگی پر کاربند رہنے والے' اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے' اپنی امانتوں اور عہد کی پاسداری کرنے والے اور اپنی نمازوں کی محافظت کرنے والے ہیں۔ انہی کو جنت الفردوس کا وارث قرار دیا گیا ہے۔

اُس کے بعد آیات ۱۱ تا ۱۶ بہت اہم ہیں' جن میں علم الجنین (embryology) جیسے اہم مضمون کے حوالے آئے ہیں۔ اس ضمن میں ویسے تو قرآن مجید میں جا بجا اشارات موجود ہیں' سورۃ الحج میں بھی تفصیل سے ان مراحل کا ذکر آیا ہے جن سے جنین رحمِ مادر میں گزرتا ہے' لیکن اس مقام پر تخلیق انسانی کے جملہ مراحل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

''ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے خلاصے سے۔ پھر ہم نے اسے نطفے کی شکل میں ایک محفوظ جگہ پر (رحم مادر میں) ٹھہرائے رکھا۔ پھر ہم نے اُس نطفے کو علقہ کی شکل دی' پھر علقہ کو مضغہ بنایا' پھر مضغہ کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر (ان تمام مراحل سے گزار کر) ہم نے اس کو ایک اور ہی تخلیق بنا دیا۔ تو بہت بابرکت ہے اللہ جو تمام خالقوں سے بہتر تخلیق فرمانے والا ہے۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے۔ پھر قیامت کے دن تم کو یقیناً اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔'' (آیات ۱۲۔۱۶)

دوسرے اور تیسرے رکوع میں اختصار کے ساتھ کچھ انباء الرسل آئے ہیں۔ اس سے پہلے یہ چیزیں سورۃ الاعراف' سورۂ ہود اور سورۃ الحجر میں بھی آ چکی ہیں۔ آیت ۳۷ میں بڑی جامعیت کے ساتھ ''نظریۂ دَہریت'' کی تعبیر چند الفاظ میں آ گئی ہے جہاں کافروں کا یہ قول نقل ہوا ہے:

﴿اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ﴾

''کوئی اور زندگی نہیں ہے سوائے ہماری اس دُنیوی زندگی کے' ہم خود ہی مرتے ہیں' خود ہی زندہ رہتے ہیں' اور ہم ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔''

اہل ایمان کی کچھ صفات کا ابتدا میں ذکر ہوا تھا' چوتھے رکوع کے تقریباً وسط میں ان میں کچھ اور صفات کا اضافہ کیا گیا ہے:

''یقیناً وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں اپنے ربّ کا خوف اور تقویٰ ہے اور وہ اُس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ جو اپنے رب کی آیات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اور (اُس کی راہ میں) جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں تو ان کے دل اس احساس سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ انہیں اپنے ربّ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو خیرات' حسنات اور بھلائیوں کے حصول میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی آگے نکل جانے والے ہیں۔'' (آیات ۵۷۔۶۱)

چھٹے رکوع کے شروع میں (جیسا کہ اکثر مکی سورتوں کے اختتام پر ہوتا ہے) حضور ﷺ کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ یہ دعا مانگئے: ''اے پروردگار! تو اگر مجھے دکھا ہی دے جس کی دھمکی انہیں دی جا رہی ہے (یعنی عذاب اگر میری زندگی ہی میں آ جائے اور تو ان کو اپنی گرفت میں لے لے) تو مجھے ظالموں کی قوم میں شامل نہ کیجیو''۔ (آیات ۹۳' ۹۴) پھر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے فرمایا ہے کہ ہم جس چیز کی ان کو دھمکی دے رہے ہیں اسے آپ کو دکھانے پر قادر ہیں۔ اب جن حالات سے آپ کو سابقہ ہے تو اچھی طریقہ پر مدافعت کیجیے' بدی کا مقابلہ حسنہ کے ساتھ کیجیے۔ ہمیں خوب معلوم ہے جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں۔ اور یہ کہا کرو ''اے پروردگار! میں تیری ہی پناہ میں آتا ہوں شیطانوں کے چھوت لگانے سے اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ وہ شیاطین میرے پاس آئیں۔'' (آیات ۹۷' ۹۸)

پھر فرمایا کہ جب کسی کی موت آ جائے گی تو وہ خواہش ظاہر کرے گا کہ اس کو لوٹا دیا جائے اور کچھ مہلت مل جائے تاکہ کچھ نیک کام کر آئے۔ اس آرزو کے جواب میں فرمایا گیا کہ ہرگز نہیں' یہ تو جب جان پر بنی ہے تو ایسی بات کہہ رہا ہے' ورنہ یہ پھر وہی حرکتیں کرے گا جو پہلے کرتا رہا ہے۔ اب ان سب کے آگے ایک برزخ حائل ہے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس دن نہ تو لوگوں کے درمیان رشتہ داریاں ہوں گی اور نہ ایک دوسرے کی بابت پوچھیں گے۔

آخر میں ارشاد ہوا:

''تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بے کار اور بے مقصد پیدا کیا اور تمہیں ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا ہے؟ بہت بلند و بالا ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ باعزت تخت کا مالک ہے۔ اور جو شخص بھی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو (اپنی حاجت روائی کے لیے) پکارتا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کافر فلاح نہیں پا سکیں گے۔ اور (اے نبی!) دعا کرو کہ اے پروردگار! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما' اور یقیناً تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر رحم کرنے والا ہے''۔ (آیات ۱۱۵۔۱۱۸)

سورۃُ النُّـور

یہ سورۃ بالاتفاق مدنی سورت ہے جو نو رکوعوں اور ۶۴ آیات پر مشتمل ہے۔ سورۂ یونس سے مکی سورتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ سورۃ المؤمنون تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مدنی سورت ہے اور حسن اتفاق سے مصحف میں یہ ساتویں مدنی سورت ہے۔ اس کی پہلی آیت خاص طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ اس میں بعض اہم احکامِ شریعت بیان ہو رہے ہیں:

﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾

''یہ ایک عظیم سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور جسے ہم نے فرض ٹھہرایا ہے اور اس میں ہم نے بڑی واضح آیات نازل کی ہیں تاکہ تم نصیحت اخذ کرو۔''

اس میں سب سے پہلے جو حکم آیا ہے وہ حد زنا ہے کہ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ ان کے معاملے میں کوئی رحمت و شفقت اور نرمی تمہارے دلوں میں پیدا نہیں ہونی چاہیے اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخرت پر یقین رکھتے ہو' اور یہ بھی کہ یہ حد لوگوں کی موجودگی میں جاری کی جائے تاکہ لوگ اس کو دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ قرآن حکیم میں زنا کی سزا کے سلسلہ میں یہی آیت وارد ہوئی ہے' لیکن شریعت اسلامی کے دوسرے سرچشمے یعنی سنتِ رسول اللہ ﷺ نے یہ معین کر دیا ہے کہ یہ حد غیر شادی شدہ زانی مرد و عورت کے لیے ہے' جبکہ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا رجم ہے۔ یہ سنتِ رسولؐ سے بھی ثابت ہے اور خلفائے اربعہ اور ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ سوائے خوارج اور اس دَور کے منکرین حدیث کے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان فتنوں سے محفوظ رکھے۔''

اس کے بعد قذف اور لعان کی حدود کا ذکر آیا ہے۔ قذف یہ ہے کہ کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور اسے ثابت نہ کر سکے۔ ایسے شخص کے لیے اسّی (۸۰) کوڑوں کی سزا کا حکم آیا ہے اور یہ بھی کہ اس شخص کی شہادت کبھی بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ لعان یہ ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اس کے پاس چار گواہ موجود نہ ہوں۔ وہ شخص چار مرتبہ قسم کھا کر کہے گا کہ میں درست کہہ رہا ہوں اور پانچویں مرتبہ یہ کہے گا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت۔ اس کے جواب میں اگر اس کی بیوی بھی چار مرتبہ قسم کھالے کہ یہ مجھ پر غلط الزام لگا رہا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو' تو وہ سزا سے بچ جائے گی۔ لیکن اگر بیوی قسم نہ کھائے تو اس پر حد جاری کر دی جائے گی۔ یہ معاملہ لعان کہلاتا ہے۔

بعدازاں سیرتِ نبویؐ کے ایک اہم واقعہ کا ذکر ہوا جو نبی اکرم ﷺ کے لیے انتہائی اذیت اور تکلیف کا موجب رہا۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا معاملہ ہے۔ دوسرے رکوع میں اس کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اُن تمام لوگوں کو ایک طرح سے بری کرنے کا حکم دیا گیا' کیونکہ اس معاملے میں ملوث تمام لوگ منافق نہیں تھے' بلکہ انہیں ''عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ'' (تمہارا ہی ایک گروہ) فرمایا۔ ان میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت اور دیگر مؤمنین بھی تھے' جن سے خطا ہوگئی۔ چونکہ انسان کی طبعی کمزوری ہے کہ وہ بری بات کو ذہناً جلدی قبول کر لیتا ہے' اس لیے اس کمزوری کا ظہور اُس دور میں اس معاملہ میں بھی ہوا۔ تاہم اس شر میں سے خیر کا پہلو یہ نکلا کہ اس کے نتیجے میں قذف اور زنا کی حدود کا بیان قرآن حکیم میں ہوا اور یہ واقعہ بہت سے دیگر احکامِ شریعت کے نزول کا ذریعہ بنا۔ البتہ واضح کر دیا گیا کہ اس معاملہ میں جس جس نے جس قدر حصہ لیا اس نے اسی قدر گناہ کمایا۔ ارشاد ہوا:

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

''ان میں سے ہر شخص کو اتنا گناہ ہوا جتنا کچھ اس نے کیا تھا' اور جس شخص نے اس معاملے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا اُس کے لیے تو بڑا سخت عذاب ہے۔''

تیسرے رکوع میں مزید احکام بیان ہوئے جن کا تعلق گھریلو زندگی سے ہے۔ سب سے پہلے گھروں میں داخلے کے احکام بیان ہوئے۔ پھر گھر کے اندر پردے کے احکام دیے گئے۔ واضح رہے کہ عورت کا ایک پردہ گھر سے باہر نامحرموں سے ہے' جس کے احکام سورۃ الاحزاب میں آئے ہیں' جبکہ سورۃ النور میں گھر کے اندر کا پردہ مذکور ہے کہ مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں کس طرح رہنا چاہیے۔ گھر میں رہتے ہوئے مردوں کی یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ اپنی نگاہوں کو جھکا کر رکھیں' اور عورتیں ساتر رہیں' ان کے سروں پر دوپٹے ہوں اور انہوں نے دوپٹوں کے بُکل اپنے سینوں پر مارے ہوئے ہوں۔ اس کے بعد محرموں کی فہرست آئی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا پانچواں رکوع جو اس کا بالکل وسطی رکوع ہے' ہمارے منتخب نصاب میں بھی شامل ہے۔ قرآن مجید کے اندر اس کی حیثیت یوں سمجھئے جیسے کسی قیمتی زیور کے اندر ایک قیمتی ہیرا جڑا ہو۔ اس رکوع میں تین عظیم تمثیلات بیان ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ایمان باللہ کی تمثیل بایں الفاظ بیان ہوئی:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ .....﴾

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں دیا رکھا ہو' اور وہ دیا ایک چمنی میں ہو (اس کے گرد شیشہ ہو) اور وہ شیشہ ایسے چمک رہا ہو جیسے کوئی چمکدار ستارہ' اور اس میں زیتون کے ایسے مبارک درخت کا تیل جل رہا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا تیل بھڑک

اُٹھنے کو بے تاب ہو اگرچہ اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو۔ یہ روشنی پر روشنی ہے۔ اللہ اپنے اسی نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے۔ اور اللہ تو ہر چیز سے باخبر ہے''۔ (آیت ۳۵)

یہ کیفیت دراصل سلیم الفطرت لوگوں کی ہوتی ہے کہ ان کے اندر نورِ فطرت تو پہلے سے موجود ہوتا ہے اور جیسے ہی ان کے سامنے نورِ وحی آتا ہے ان کا آئینہ قلب جگمگا اٹھتا ہے۔ اس کے بعد کچھ کیفیات بیان ہوئی ہیں کہ جن کے دلوں میں یہ نور پیدا ہو جاتا ہے وہ مساجد میں اللہ کو صبح و شام یاد کرتے ہیں۔ انہیں ان کے کاروبار اللہ کے ذکر' اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتے۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جب مارے خوف کے دل اُلٹ جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

اس کے بعد دو تمثیلیں اہل باطل کے لیے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں اگرچہ ایمان نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ کوئی نہ کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان کے اعمال سراب کی مانند ہیں۔ ایک پیاسا صحرا نورد دُور سے تپتی ہوئی ریت کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ وہ پانی ہے اور اس کی طرف چلتا رہتا ہے۔ پانی تو اس کو ملتا نہیں' البتہ موت اس کی منتظر ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے حضور پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا حساب چکا دیا جاتا ہے۔

دوسری مثال ایسے لوگوں کی بیان ہوئی جو اپنی زندگی سراسر عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں صرف کر رہے ہیں اور جھوٹ موٹ کی نیکیوں سے بھی دور ہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں ان گھٹا ٹوپ تاریکیوں کی مثال دی گئی جو کسی سمندر کی گہرائی میں ہوں۔ رات بھی اندھیری ہو اور اوپر بادل بھی ہوں۔ یعنی تہہ در تہہ تاریکی۔ ایسی تاریکی میں جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالتا ہے تو اسے دیکھ نہیں پاتا۔ جس کو اللہ ہی کی جانب سے نور عطا نہ ہوا ہو تو اس کو کہیں سے بھی نور نہیں مل سکتا۔

آیت ۴۵ میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ساتویں رکوع کے آغاز میں فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس کے بعد آیت ۵۵ میں ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کرنے والوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا گیا۔ یہ آیہ مبارکہ ''آیتِ استخلاف'' کہلاتی ہے۔

آٹھویں رکوع کے آغاز میں ارشاد ہوا کہ تین اوقات ایسے ہیں کہ ان میں تمہارے نوکر چاکر اور چھوٹے بچے بھی اجازت لے کر تمہارے ہاں آئیں۔ نماز فجر سے قبل' دوپہر کے وقت جب تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ اس کے بعد فرمایا کہ وہ بوڑھی عورتیں جو اَب نکاح کی امیدوار نہ ہوں' وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں' بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے

والی نہ ہوں۔

سورۂ مبارکہ کے آخر میں اہل ایمان کی ان امور کی جانب رہنمائی کی گئی جن سے اسلامی نظم جماعت میں ایک عمدہ ماحول اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رہ سکتی ہے —— ارشاد ہوا:

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولؐ پر، اور جب وہ ان (ﷺ) کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں ہوتے ہیں تو وہ وہاں سے ہرگز نہیں جاتے یہاں تک کہ اُن سے اجازت حاصل کرلیں..... مسلمانو! اپنے درمیان رسولؐ کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے سٹک جاتے ہیں۔ رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔ خبردار رہو، آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔ (آیات ۶۲۔۶۴)

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات

☆ تلاوتِ قرآن، دروسِ قرآن، دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ

☆ صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم

☆ میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

☆ اردو اور انگریزی کتابیں

☆ آڈیو، ویڈیو کیسٹس، سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Visit us at www.tanzeem.org

اَخلاق

نبوّت سے اکتسابِ فیض کی شرط اور علامت

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہِ الکریم
اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ..... بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الاعراف)

سیرت نگارانِ رسول ﷺ میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ کی بعثت کے لیے اہلِ عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا؟

مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب ''ثورة الاسلام وبطل الانبياء'' کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے:

''دنیا کی تاریخ، انسانی تمدن کی داستان اور قدیم وجدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے ہی قابل توجیہہ واقعات اور پہیلی یا معمہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں سامنے آتی ہیں جنہیں پڑھ کر یا سن کر آدمی محوِ حیرت رہ جاتا ہے—— اور اسی قسم کے ناقابل فہم معموں میں سے یہ چیستان بھی ہے کہ آخر اللہ نے انوارِ نبوت ورسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لیے جزیرۃ العرب کو ہی کیوں منتخب کیا؟'' (لطفی، ص ۷)

اور کچھ آگے چل کر اہلِ عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال دہرایا ہے:

''آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین کا سرچشمہ اور اس کا

مرکز و منبع بنانے کے لیے چن لیا؟ (لطفی، ص ۳۸)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں ''عربوں کی خصوصیات اور خیر الامم بننے کی صلاحیت'' کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب سے بحث کی ہے۔ اس موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''نبی رحمت ﷺ'' میں کی گئی ہے، جس کے ایک باب کا عنوان ہے: ''محمد رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟'' —— اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخابِ ربانی کے لیے اہلِ عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف اسباب یا نکات گنوائے ہیں۔ مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص خاص اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے جس نے ان لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔''

آخر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی تمام مہذب اور متمدن قوموں کو چھوڑ کر عرب کے ان گمنام نشینوں کو اس منصبِ عظیم کے لیے کیوں چن لیا؟ اگر یہی نبی ہندوؤں، بدھوں، یہودیوں یا چینیوں، ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک قوم میں مبعوث کر دیے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے اور ویسا ہی انقلاب برپا نہ ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعے سے ہوا؟ جو وقت کی ''بڑی طاقتیں'' (super powers) تھیں، کیا ان میں سے کوئی بھی ''بہترین'' اُمت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی؟ —— بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں، اس لیے کہ مصالح کلیہ اُلٰہیہ کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسی لیے قرآن کریم نے اس مسئلہ پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ﴾ (الانعام:۱۲۴)

''اور اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا پیغام کہاں اور کس کے حوالے کیا جائے!''

تاہم اس اندازِ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آ سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبیؐ سے انتساب اور اسلام کے نعرہ ہائے بے حد و حساب اور ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ کیا ہم کہیں عہدِ جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط قرار دیا جا سکتا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کایا پلٹ دی وہ عجائباتِ تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلبِ ماہیت اور تاریخ عالم کے اس سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہمہ گیری اور وسعت کو سمجھنے کے لیے سیرت نگار ظہورِ اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب کی خصوصاً دینی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت بلکہ ان سب حالتوں

کی ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے۔

عجمی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم وبیش سیرت یا تاریخ کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ کا تجزیہ جس طرح شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں کیا ہے' کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور اُس دَور کے رسم ورواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معناً یہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے' بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے۔ حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہبِ عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات وتالیفات سے استفادہ اور دائرہ ہائے معارف کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کا موقع ملا جن کا شاہ صاحب کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرتِ انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل وتفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعیش پسندی' تن آسانی اور دنیوی لذائذ ومفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لیے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے (کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتسابِ فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں' خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیر الامم بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ہرگز ممکن نہیں ہوتا ——— اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیتِ الٰہی نے ان اقوام کو اس منصبِ عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام رذائل وفضائل پر ایک نظر ڈالیں جو فیضانِ نبوت کی بدولت بہترین اُمت بن گئے' تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی' ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر ''شبِ ظلمت''، ''عرب کا تاریک دَور'' اور ''فسادِ بر وبحر'' وغیرہ عنوانات کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض وانتقام' سنگدلی وسفاکی' چوری اور رہزنی' قتل وغارت' بے حیائی وبدتمیزی' زنا وفواحش' نسبی تعصب وغرور' قمار بازی' شراب نوشی اور دختر کشی وسود خوری میں قریب قریب ضرب المثل تھے۔ ان سب معائب کی تفصیل سے ادب وتاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معریٰ نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظامِ اخلاق کے بدترین اجزاء میں بھی اخلاقِ حسنہ کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی'

فیاضی اور سخاوت کا مظہر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ قبائلی عصبیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت، پابندیٔ عہد، شجاعت، فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (بھلائی)، امانت، راست گوئی اور پاک دامنی کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے، اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے توقیر و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقِ حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی، حبِّ جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزاء بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا۔ مشہور حدیث ((خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا))[1] میں اس ''تحویل قبلۂ اخلاق'' کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی خِيَارُكُمْ کی تفسیر ((إِنَّ خِيَارَكُمْ اَحَاسِنُكُمْ اَخْلَاقًا))[2] سے کی گئی ہے۔

دورِ جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے، اس کی ایک مثال تاریخ نے ''حِلف الفُضول'' کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اسی حلف میں (جس کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض خانوادوں کے نمائندوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم و بے انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مبصر یا خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے، ایک مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔ یہ حلف جسے سیرت نگار ''اکرم حلف واشرفه سمع به فی العرب'' (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں، ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض و مقاصد یوں تھے:

> ''انہوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے اور ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کیے گئے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔'' (سیرت ابن ہشام)

کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرۂ نفاذ بہت محدود تھا۔ اس کا مقصد صرف حرمِ مکہ میں مظالم کی روک تھام تھا، اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا تاکہ حرم کی عزت و حرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ ہونے پائے۔ لیکن کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم ہے؟ چلیے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی —— حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدے کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا (تفصیل کے لیے دیکھئے: ابن کثیر، جلد اوّل، ص ۶۱۔۲۵۹)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ام کنتم شهداء اذ حضر یعقوب الموت .....

(۲) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء وما یکره من البخل۔

آج یو این او اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں' اسے سامنے رکھیں تو حلف الفضول منعقد کرنے والوں کی اخلاقی قوت' ان کی فطرتِ سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الامم کے ہراول دستوں میں شمولیت کے شرف کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔"

آقائے دو جہاں ﷺ خود بھی (بعمر بیس سال) عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدے میں شامل ہوئے تھے۔ آپؐ اس معاہدے سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپؐ نے اس کی تعریف و تحسین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس و خاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں' تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظتِ حق اور اعانتِ مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے کچھ نیچے ہی کے درجے پر ہیں۔"

اہل عرب کی مثال ایک ایسی زرخیز زمین کی تھی جو کاشت و نگہداشت نہ ہونے کے باعث خودرو خاردار جھاڑیوں کا جنگل بن گئی تھی۔ ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوتِ نمو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ ہادیٔ برحق نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو ترتیب دے کر مکارمِ اخلاق کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور حق دار ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ﴿وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا﴾ (الفتح:۲۶)

ہمارے اس موقف کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے لیے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں' کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متصف بھی۔

سب سے پہلے اُمّ المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ دیکھئے۔ وہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی پاک بازی کے باعث "طاہرہ" کے لقب سے مشہور تھیں۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

"وہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاک دامنی کے باعث طاہرہ کہہ کر پکاری جاتی تھیں۔"

حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت ﷺ کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپؐ کو گھر میں بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا:

"اے میرے چچازاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ آپ سے میری (برادری کی) رشتہ داری بھی ہے۔ آپ اپنی قوم میں صاحبِ عزت بھی ہیں۔ ان سب پر مستزاد آپ کی امانت' اخلاص اور راست گفتاری ہے۔"

پہلی وحی کے نزول اور بعثت کے ابتدائی ایام میں جو واقعات و حالات پیش آئے تھے ان کی بنا پر

حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی:

''ہرگز نہیں! بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے ہیں' دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں' محتاجوں کے کام آتے ہیں' مہمان نواز ہیں اور راہِ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔''

مَردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے بارے میں سیرت نگار لکھتے ہیں کہ آپ ایک با اخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام اَخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنہ کے بیان سے ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ابوبکر الصدیق بھی آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو ایک دن کے فاصلے پر انہیں ابن الدغنہ ملا (اصل نام سبیعہ بن رفیع تھا اور وہ اس وقت امابیش کا سردار تھا جو ایک مجموعہ قبائل تھا)۔ اس نے پوچھا: تم کہاں چلے؟ جب انہوں نے بتایا کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے بہت ہی اذیت پہنچائی ہے اور سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے تو ابن الدغنہ نے کہا:

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بخدا آپ تو قبیلہ کے مایۂ ناز فرزند ہیں۔ آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں' نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلیے' میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔''

ہم ان مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں' ورنہ تمام ''سابقین اوّلین'' صحابہ رضی اللہ عنہم میں قبل از اسلام ہی کسی نہ کسی خالص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ہی ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاکؐ کے محاسن و فضائل کے جمالِ بے مثال میں سے آپؐ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپؐ کے ''خلقِ عظیم'' ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دِل موہ لیے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم کو بھی معلوم ہے' مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے صاحبِ خلقِ عظیم ہونے کا تعلق آپؐ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیاتِ نبویؐ کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝﴾ (آپؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلمہ امر ہے) کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مشہور حدیث ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن''(۱)

(۱) مسند احمد' ح ۲۳٤٦۰۔

(آپ کا اخلاق تو قرآن تھا) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورﷺ کے اخلاق کی تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۝﴾ سورۃ القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے کہ سورۃ القلم بلحاظِ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دور کی مکی سورت ہے' اور یہ آیت مبارکہ آنحضرتﷺ کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن پاک نے پیش کی۔ (اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۂ یونس اور سورۃ العنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)

قرآن حکیم کا آپﷺ کے خلقِ عظیم کو بطور دلیل پیش کرنے سے مدحیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں' ازاں جملہ: ؎

اوّلاً یہ کہ —— اہل مکہ (جو جاہلیت عرب کے رذائل وفضائل کے نمائندہ قرار دیے جا سکتے ہیں) میں عموماً اتنی اخلاقی حس ضرور تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کیے جا سکتے تھے' اور یہی وجہ ہے کہ آنحضورﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی سورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۴) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعۂ رذائل ہو' چاہے وہ کتنا ہی صاحبِ جاہ و مال ہو' اسے ہیچ سمجھو۔ فرمایا:

﴿وَلَا تُطِعۡ کُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیۡنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِیۡمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ ۝ اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیۡنَ ۝﴾

''ہرگز نہ دبو اُس شخص سے جو قسمیں کھانے والا' پست فطرت' طعنہ جو' چغل خور' مانع خیر' دھاندلی باز' بدعمل' جفاکار اور ساتھ ہی بداصل بھی ہے' محض اسی بنا پر (چودھری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال واولاد رکھتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین ''خلقِ عظیم'' اور ان آیات میں بیان کردہ ''رذائلِ تسعہ'' کے تغایر وتباین کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ —— اس آیت ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۝﴾ کے مضمون اور اس کے زمانۂ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرتﷺ قبل از بعثت ہی صاحبِ خلقِ عظیم تھے۔ محمد عزت دروزہ لکھتے ہیں: ؎

''اور یہ خلقِ عظیم جس کی بنا پر آنحضورﷺ اس ثنائے ربانی کے مستحق ٹھہرے' اس سے آپؐ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے' بلکہ اسی چیز نے آپؐ کو اس برگزیدگی اور اس منصبِ عظیم کا اہل بنا دیا تھا' اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لیے کون اور کتنا موزوں ہے۔''

یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضورﷺ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے تدریجاً نمودار

کیا ہے۔ قرآن وسنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرت ﷺ کے خلق عظیم کے خدوخال کی مکمل تصویر کشی ہے، اور اسی لیے آپؐ کی ذاتِ گرامی کو اُمت کے لیے ''اُسوۂ حسنہ'' قرار دیا گیا۔ خود اُسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ —— اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوتِ محمدی (علیٰ صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی ونقلی دلائل کی تبلیغ واشاعت مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔ اس کے لیے عہدِ رسالت اور قرنِ اوّل کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضورﷺ کے صرف دو معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ ایک قرآن، دوسرے اخلاق النبیؐ۔ ابتدائے اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متأثر ہوا یا نبی اکرمﷺ کا خلقِ عظیم دیکھ کر۔ اہلِ مکہ خلقِ محمدی کا مشاہدہ کر سکتے تھے —— مابعد النبی ادوار میں دُنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری اُمت پر ہے کہ ایک طرف اخلاقیاتِ نبوی سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر (حسبِ استطاعت) فرضِ عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیاتِ نبوی کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ واشاعت سب مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔''

رابعاً یہ کہ —— آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور مؤثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لیے، اس کے غلبہ کا دورِ ثانی لانے کے لیے اور فیوض و برکاتِ نبوت کو پھیلانے کے لیے صرف اور صرف گرمیٔ گفتار، پروپیگنڈا اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سیمینار نہیں بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ و تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہوگی۔ اسلام جہاں بھی پہنچا ہے، زیادہ تر صلحائے اُمت کے اخلاق وکردار کی بدولت پہنچا ہے۔

آنحضرتﷺ نے ابتدا سے ہی صرف اخلاقی نظریاتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا۔ توحید، رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسنِ اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمان کی ایک لازمی خصوصیت یا بالفاظِ دگر نبوّت سے اکتسابِ فیض کی علامت قرار دیا۔ یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہدِ رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرامؓ کے کارنامہ ہائے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

(۱) حضرت ابوذر غفاریؓ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں۔ انہوں نے جب آنحضرتﷺ کے اعلانِ نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو دریافتِ احوال کے لیے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس جا کر آنحضورﷺ کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی:

''وہ بھلائی کا حکم دیتا، برائیوں سے منع کرتا اور مکارمِ اخلاق کا حکم دیتا ہے۔''

یہاں اخلاق کے ضمن میں ''تعلیم'' یا ''تلقین'' یا ''تبلیغ'' وغیرہ کی بجائے ''امر'' کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر ودانش سے نہیں، قوتِ عمل سے ہے۔ یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی

تربیت کا نام ہے۔

(۲) ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب ؓ نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاحِ عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے قابل غور ہیں:

ُ کہا: ''اے بادشاہ! ہم پروردۂ جاہلیت قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے' مردار کھاتے اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے۔ رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور ہمسایوں کو دکھ دیتے تھے' اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کر کھا جاتا۔ پھر اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے خاندان' حسب نسب اور جس کی سچائی' امانت اور پاک بازی سے ہم پہلے واقف تھے۔ انہوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور انہوں نے ہم کو سچ بولنے' امانت ادا کرنے' رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے' پڑوسی سے حسن سلوک کرنے' ناجائز اور حرام باتوں اور خونریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں' جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا۔ پس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی۔ جو انہوں نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانا اور جو انہوں نے حلال بنایا اس کو حلال تسلیم کیا۔'' (سیرت ابن ہشام)

آنحضور ﷺ نے مکارمِ اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ آپؐ زمانۂ جاہلیت کے اصحابِ مکارم و محاسن کی قدردانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ عبداللہ بن جدعان (بانی حلف الفضول) کو آپؐ نے کتنی دفعہ تعریف بھرے الفاظ سے یاد فرمایا' حالانکہ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ جس آدمی نے (ایمان لا کر) زندگی میں ایک دفعہ بھی اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟

اسی قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے۔ وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

''حضور! میرا باپ ہلاک ہو گیا اور فدیہ گزار نہ رہا۔ اگر یہ مناسب جانیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں۔ میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا۔ وہ نیک شہرت کا مالک تھا۔ مہمان نوازی کرتا تھا اور بھوکوں ننگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا اور اس نے کبھی کسی حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا۔ میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بچی! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہی تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لیے دعائے رحمت بھی مانگتے۔'' پھر حکم دیا کہ اسے رہا کر دیا

جائے کیونکہ اس کا باپ مکارمِ اخلاق کو پسند کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی مکارمِ اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔

یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور سوال کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! کیا مکارمِ اخلاق آپؐ کو (اس قدر) پسند ہیں؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی ایک آدمی بھی جنت میں حسنِ عمل کے بغیر نہیں جائے گا۔''

جب بھی ہم مکارمِ اخلاق اور اخلاقیاتِ نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیرِ کردار کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لیے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب بھی ضروری ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثنا کا حق دار ٹھہرنا عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیرِ اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی ''**اجتناب کبائر**'' اور ''**مسابقت علی الخیرات**'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلاً كَرِيْمًا﴾ (النساء)

''جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے قصور محو کر دیں گے اور تم کو مقامِ عزت پر جگہ دیں گے۔''

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸)

''اور ہر ایک (مقام) کا ایک مرکزِ توجہ (یا مطمح نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو۔''

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تربیت اور تکمیل کے لیے اس ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپؐ نے سب سے پہلے ان اصولی اور بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش اور نبوت سے اکتسابِ فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آتے ہیں جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ تھا۔ نبی ﷺ سے متعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام کو قبول کرنے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار کریں۔ اسلام لانے کے بعد، مسلمان کہلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہونا اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور ہے۔ بقول اقبال:

آنکہ از صدق و امانت بے خبر　　روزِ تمہید رسالت بے خبر
کارِ او گفتارِ بے کیف عمل　　او نیامِ علم بے سیفِ عمل

لذتِ ایماں فزاید در عمل ؎ مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

نبوت سے اکتسابِ فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارمِ اخلاق ہیں جنہیں مقصودِ بعثتِ نبوی ؐ کہا گیا ہے۔

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ))(۱)

''میں مکارمِ اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

مگر مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچ سکنا فیضِ نبوت سے یکسر محرومی نہ سہی ''کم نصیبی'' کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے ''رموزِ بے خودی'' میں گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ؎

آ نکہ مہتاب از سر انگشتش دونیم رحمت او عام و اخلاقش عظیم

از بہارش رنگ و بو باید گرفت بہرہَ از خلق او باید گرفت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے! اتنا ہی اس کے ہاں تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاں ہمارا کیا درجہ ہے (کیونکہ مصطفیٰ سے بعد ہی تو ابو الحسن ہے) تو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبوی ؐ سے کتنا حصہ پایا ہے!

۞۞۞

[حافظ صاحب مرحوم ومغفور کا یہ مضمون شیخ زائد اسلامک سنٹر' جامعہ پنجاب لاہور کی جانب سے شائع کردہ کتاب ''قرآن وسنت: چند مباحث'' سے لیا گیا ہے۔ احادیث کی تخریج قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات نے کی ہے۔]

---

(۱) مجمع الزوائد للهيثمى ۱۸/۹۔ ومختصر المقاصد للزرقانى' ح ۱۸۴۔ السلسلة الاحاديث الصحيحة للالبانى' ح۴۵۔ راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ مسند احمد کی روایت میں ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ صَالِحَ الْاَخْلَاقِ)) جبکہ موطا امام مالک میں ((...... حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) کے الفاظ ہیں۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۱۴۴۔۱۴۵

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ■ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ □﴾

ترکیب: ''مَا'' کا اسم ''مُحَمَّدٌ'' ہے۔اس کی خبر محذوف ہے اور ''مُحَمَّدٌ'' کا بدل ہونے کی وجہ سے ''رَسُوْلٌ'' مرفوع ہے۔''خَلَتْ'' کا فاعل ''الرُّسُلُ'' ہے۔''اَفَائِنْ'' کا جوابِ شرط ''اِنْقَلَبْتُمْ'' ہے۔ ''وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ'' میں ''كَانَ'' کی خبر محذوف ہے جو کہ ''مُمْكِنًا'' ہوسکتی ہے۔''كِتَابًا مُّؤَجَّلًا'' کو تفسیر حقانی میں فعل محذوف کا مفعول مطلق مانا گیا ہے۔لیکن ہماری ترجیح یہ ہے کہ اسے ظرف مانا جائے۔

ترجمہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ: اور نہیں ہیں محمد (ﷺ)	اِلَّا: مگر
رَسُوْلٌ: ایک رسول	قَدْ خَلَتْ: گزرے ہیں
مِنْ قَبْلِهِ: انؐ سے پہلے	الرُّسُلُ: رسول (لوگ)
اَفَائِنْ: تو کیا اگر	مَّاتَ: وہؐ بے جان ہوجائیں گے

اَوْ قُتِلَ :یا قتل کیے جائیں گے
عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ :اپنی ایڑیوں پر
یَّنْقَلِبْ : پلٹے گا
فَلَنْ یَّضُرَّ :تو وہ ہرگز نقصان نہیں کرے گا
شَیْئًا : کچھ بھی
اللّٰہُ :اللہ
وَمَا کَانَ :اور نہیں ہے (ممکن)
اَنْ :کہ
اِلَّا :مگر
کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا :ایک لکھے ہوئے مقررہ وقت پر
یُّرِدْ :ارادہ کرتا ہے
نُؤْتِہٖ :تو ہم دیتے ہیں اس کو
وَمَنْ :اور جو
ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ :آخرت کے بدلے کا
مِنْھَا :اس میں سے
الشّٰکِرِیْنَ :شکر کرنے والوں کو

انْقَلَبْتُمْ :تو تم لوگ پلٹ جاؤ گے
وَمَنْ :اور جو
عَلٰی عَقِبَیْہِ :اپنی دونوں ایڑیوں پر
اللّٰہَ :اللہ کا
وَسَیَجْزِی :اور عنقریب جزا دے گا
الشّٰکِرِیْنَ :شکر کرنے والوں کو
لِنَفْسٍ :کسی جان کے لیے
تَمُوْتَ :وہ بے جان ہو
بِاِذْنِ اللّٰہِ :اللہ کی اجازت سے
وَمَنْ :اور جو
ثَوَابَ الدُّنْیَا :دنیا کے بدلے کا
مِنْھَا :اس میں سے
یُّرِدْ :ارادہ کرتا ہے
نُؤْتِہٖ :تو ہم دیتے ہیں اس کو
وَسَنَجْزِی :اور عنقریب ہم جزا دیں گے

آیات ۱۴۶ تا ۱۴۸

﴿وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ فَمَا وَھَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَمَا کَانَ قَوْلَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝ فَاٰتٰىھُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾

ک و ن

کَانَ (ن) کَوْنًا :کسی چیز کا اپنا وجود پانا' واقع ہونا' ہو جانا۔ افعالِ ناقصہ میں سے ہے۔
کُنْ (فعل امر): تو ہو جا۔ ﴿وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ■﴾ (الاعراف) ''اور تو ہو جا شکر کرنے والوں میں سے۔''

مَکَانٌ (مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف) :واقع ہونے کی جگہ' پھر مطلقاً جگہ' ٹھکانہ وغیرہ کے معانی میں آتا ہے۔ ﴿وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَةً مَّکَانَ اٰیَةٍ﴾(النحل:۱۰۱) ''اور جب ہم بدلتے ہیں کسی آیت کو کسی آیت کی جگہ۔'' ﴿اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا﴾(المائدۃ:۶۰) ''وہ لوگ زیادہ برے ہیں ٹھکانے کے لحاظ سے۔''

اِسْتَکَانَ (استفعال) اِسْتِکَانَةً :عاجزی کرنا' جھک جانا۔(آیت زیر مطالعہ)

س ر ف

سَرَفَ (ن) سَرْفًا :کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ ہونا۔

اَسْرَفَ (افعال) اِسْرَافًا :کسی چیز کو ضرورت سے زیادہ کرنا' کسی کام میں حد سے تجاوز کرنا۔ ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (الزمر:۵۳) ''اے میرے بندو! جنہوں نے حد سے تجاوز کیا اپنے آپ پر' تم لوگ مایوس مت ہو اللہ کی رحمت سے۔''

مُسْرِفٌ (اسم الفاعل) : حد سے تجاوز کرنے والا۔ ﴿وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ (المؤمن) ''اور یہ کہ حد سے تجاوز کرنے والے ہی آگ والے ہیں۔''

ترکیب :''کَاَیِّنْ'' یہاں کم خبریہ کے معنی میں آیا ہے۔''مِنْ نَّبِیٍّ'' اس کا اسم ہے۔''مَعَهٗ'' میں ''ٗهٗ'' کی ضمیر ''نَبِیٍّ'' کے لیے ہے۔لفظی رعایت کے تحت ضمیر واحد آئی ہے لیکن کم خبریہ کا اسم ہونے کی وجہ سے اس میں جمع کا مفہوم ہے۔''قٰتَلَ'' کا فاعل ''رِبِّیُّوْنَ'' ہے''کَثِیْرٌ'' اس کی صفت ہے۔''کَثِیْرٌ'' واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور اس کی جمع ''کَثِیْرُوْنَ'' بھی آتی ہے' لیکن یہ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوئی۔''قَالُوْا رَبَّنَا'' سے ''الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ'' تک پورا جملہ کَانَ کا اسم ہے اور ''قَوْلَهُمْ'' کَانَ کی خبر مقدم ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

ترجمہ:

وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ :اور نبیوں میں سے کتنے ہی ہیں	قٰتَلَ :قتال کیا
مَعَهٗ :جن کے ساتھ (مل کر)	رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ: بہت سے اللہ والوں نے
فَمَا وَهَنُوْا :تو وہ لوگ ہمت نہیں ہارے	لِمَآ :اس سے جو
اَصَابَهُمْ :پہنچی ان کو (کوئی تکلیف)	فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ :اللہ کی راہ میں
وَمَا ضَعُفُوْا :اور نہ کمزور ہوئے	وَمَا اسْتَکَانُوْا: اور نہ جھکے
وَاللّٰهُ :اور اللہ	یُحِبُّ :پسند کرتا ہے
الصّٰبِرِیْنَ :ثابت قدم رہنے والوں کو	وَمَا کَانَ :اور نہیں تھا
قَوْلَهُمْ :ان کا کہنا	اِلَّآ اَنْ :سوائے اس کے کہ

قَالُوْا : انہوں نے کہا
رَبَّنَا : اے ہمارے ربّ
اغْفِرْ : تو بخش دے
لَنَا : ہمارے لیے
ذُنُوْبَنَا : ہمارے گناہوں کو
وَاِسْرَافَنَا : اور ہمارے حد سے تجاوز کرنے کو
فِیْٓ اَمْرِنَا : ہمارے کام میں
وَثَبِّتْ : اور تو جما دے
اَقْدَامَنَا : ہمارے قدموں کو
وَانْصُرْنَا : اور تو ہماری مدد کر
عَلَى الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ : کافروں کی قوم (کے مقابلہ) پر
فَاٰتٰھُمُ : تو دیا ان کو
اللّٰهُ : اللہ نے
ثَوَابَ الدُّنْیَا : دنیا کا ثواب
وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ : اور آخرت کے ثواب کا حسن
وَاللّٰهُ : اور اللہ
یُحِبُّ : پسند کرتا ہے
الْمُحْسِنِیْنَ : بلاکم و کاست کام کرنے والوں کو

آیات ۱۴۹ تا ۱۵۱

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ◆ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىکُمْ ۚ وَھُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ ◆ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىھُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ◆﴾

ر ع ب

رَعَبَ (ف) رَعْبًا : خوف زدہ ہونا' ڈرنا۔

رُعْبٌ (اسم ذات) : خوف' ہیبت' دہشت۔ (آیت زیر مطالعہ)

س ل ط

سَلِطَ (س) و سَلُطَ (ک) سَلَاطَةً : کسی پر غلبہ حاصل کرنا' مسلط ہونا۔

سُلْطَانٌ (فُعْلَانٌ کے وزن پر مبالغہ) : متعدد معانی میں آتا ہے: (۱) زبردست قوت (۲) اختیار' غلبہ۔ (۳) قطعی دلیل' سند۔ ﴿اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۳۳﴾ (الرحمٰن) ''اگر تم لوگوں میں استطاعت ہے کہ تم لوگ نکلو آسمانوں اور زمین کی قطاروں سے تو نکلو۔ تم لوگ نہیں نکلو گے مگر کسی قوت سے۔'' ﴿وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ

دَعَوْتُكُمْ﴾(ابراھیم:۲۲) ''اور نہیں تھا میرے لیے تم لوگوں پر کسی قسم کا کوئی اختیار سوائے اس کے کہ میں نے دعوت دی تم لوگوں کو۔''

سَلَّطَ (تفعیل) تَسْلِیْطًا :کسی کو کسی پر اختیار دینا' غلبہ دینا۔﴿وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ (الحشر:٦) ''اور لیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو اس پر جس پر وہ چاہتا ہے۔''

ء و ی

اَوٰی (ض) اِوَاءً :کسی کے ساتھ جڑ جانا' ضم ہو جانا۔اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں آتا ہے۔کسی جگہ اُترنا' پناہ لینا وغیرہ۔﴿سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ﴾ (ھود:٤٣) ''میں ٹھہروں گا کسی پہاڑ پر وہ بچالے گا مجھ کو پانی سے۔''

مَاْوًی (اسم الظرف) :اُترنے یا ٹھہرنے کی جگہ' منزل' پناہ گاہ۔(آیت زیر مطالعہ)

اٰوٰی (افعال) اِیْوَاءً :ٹھہرانا' جگہ دینا۔﴿وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ﴾ (یوسف:٦٩) ''اور جب وہ لوگ داخل ہوئے یوسفؑ کے پاس تو انہوں نے جگہ دی اپنے پاس اپنے بھائی کو۔''

ث و ی

ثَوٰی (ض) ثَوَاءً :کسی جگہ مستقل قیام کرنا' ٹھکانہ بنانا۔

ثَاوٍ (اسم الفاعل) :قیام کرنے والا۔﴿وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِیْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ﴾(القصص:٤٥) ''اور آپؑ قیام کرنے والے نہیں تھے اہل مدین میں۔''

مَثْوًی (اسم الظرف):مستقل قیام کرنے کی جگہ' ٹھکانہ۔(آیت زیر مطالعہ)

ترکیب:''اِنْ'' کا جواب شرط ''یَرُدُّوْکُمْ'' ہے۔''فَتَنْقَلِبُوْا'' کا ''فا'' سببیہ ہے۔''خٰسِرِیْنَ'' حال ہے۔''مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا'' یہ پورا جملہ ''اَشْرَکْتُمُوْنِ'' کا مفعول ہے۔''یُنَزِّلْ'' کی ضمیر فاعلی اللہ کے لیے ہے۔

ترجمہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ	اے لوگو! جو
اٰمَنُوْۤا	ایمان لائے
اِنْ تُطِیْعُوا	اگر تم لوگ اطاعت کرو گے
الَّذِیْنَ	ان لوگوں کی جنہوں نے
كَفَرُوْا	کفر کیا
یَرُدُّوْكُمْ	تو وہ لوگ لوٹا دیں گے تم کو
عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ	تمہاری ایڑیوں پر
فَتَنْقَلِبُوْا	نتیجتاً تم لوگ پلٹو گے
خٰسِرِیْنَ	خسارہ اٹھانے والے ہوتے ہوئے
بَلِ	بلکہ
اللّٰهُ	اللہ
مَوْلٰىكُمْ	تمہارا کارساز ہے
وَهُوَ	اور وہ
خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ	بہترین مددگار ہے

سَنُلْقِیْ :ہم ڈالیں گے
فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ :ان کے دلوں میں جنہوں نے
کَفَرُوا :کفر کیا
الرُّعْبَ :دہشت
بِمَآ :بسبب اس کے جو
اَشْرَکُوْا :انہوں نے شریک کیا
بِاللّٰہِ :اللہ کے ساتھ
مَا :اس کو
لَمْ یُنَزِّلْ :اس نے اتاری ہی نہیں
بِہٖ :جس کے لیے
سُلْطٰنًا :کوئی سند
وَمَاْوٰھُمُ :اوران کی منزل
النَّارُ :آگ ہے
وَبِئْسَ :اور کتنی بری ہے
مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ: ظالموں کی قیام گاہ

آیات ۱۵۲، ۱۵۳

﴿وَلَقَدْ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعْدَہٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَھُمْ بِاِذْنِہٖ حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ ۚ ثُمَّ صَرَفَکُمْ عَنْھُمْ لِیَبْتَلِیَکُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ ؕ وَاللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ❖ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ❖﴾

ص ع د

صَعِدَ (س) صَعْدًا :سیڑھی یا بلندی پر چڑھنا۔﴿اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ﴾(فاطر:۱۰) ''اس کی طرف ہی چڑھتا ہے پاکیزہ کلام۔''

صَعَدٌ (صفت): چڑھائی والا، مشکل۔﴿وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّہٖ یَسْلُکْہُ عَذَابًا صَعَدًا ❖﴾ (الجنّ) ''اور جو اعراض کرتا ہے اپنے ربّ کی یاد سے تو وہ ڈالے گا اس کو ایک مشکل عذاب میں۔''

صَعُوْدٌ (فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ) :دشوار چڑھائی۔﴿سَاُرْھِقُہٗ صَعُوْدًا ❖﴾ (المدثّر) ''میں مبتلا کروں گا اس کو ایک دشوار گزار چڑھائی میں۔''

صَعِیْدٌ (فَعِیْلٌ کا وزن): زمین کی سخت سطح (۱) میدان۔ (۲) مٹی۔﴿وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْھَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۝﴾ (الکھف) ''اور بے شک میں بنانے والا ہوں اس کو جو اس (زمین) پر ہے ایک بنجر

میدان۔'' ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (النساء:۴۳) ''تو تم لوگ تیمّم کرو کسی پاک مٹی سے۔''

اَصْعَدَ (افعال) اِصْعَادًا :اونچی زمین میں سفر کرنا' تیز دوڑنا۔(آیت زیر مطالعہ)

تَصَعَّدَ (تفعّل) تَصَعُّدًا : بتکلف چڑھنا' ہانپتے کانپتے چڑھنا۔﴿كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام:۱۲۵) ''گویا کہ وہ ہانپتے کانپتے چڑھتا ہے آسمان میں۔''

ف و ت

فَاتَ (ن) فَوْتًا :کسی چیز کا کسی چیز کی دسترس یا پہنچ سے دور ہو جانا' ہاتھ سے نکل جانا۔(آیت زیر مطالعہ)

تَفَاوَتَ (تفاعل) تَفَاوُتًا: ایک دوسرے کی پہنچ سے دور ہونا' باہم مختلف ہونا۔﴿مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ﴾ (الملك:۳) ''تو نہیں دیکھے گا رحمٰن کی خلقت میں کسی طرح سے مختلف ہونا۔''

ترکیب:''صَدَقَ'' کا مفعول اوّل ''كُمْ'' کی ضمیر ہے اور ''وَعْدَهٗ'' مفعول ثانی ہے۔''حَتّٰى اِذَا'' میں ''اِذَا'' پیچھے کے ''اِذْ'' پر عطف ہے' اس لیے یہ ماضی کے معنی دے گا۔''فِي الْاَمْرِ'' پر لام تعریف ہے۔''تُلُوْنَ'' کا مفعول محذوف ہے جو ''اَعْنَاقَكُمْ'' ہو سکتا ہے۔''اُخْرٰىكُمْ'' میں ''اُخْرٰى'' ''فُعْلٰى'' کے وزن پر صفت ہے۔اس کا موصوف محذوف ہے جو ''طَائِفَةٍ'' ہو سکتا ہے۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اور یقیناً سچ کر دیا ہے تم سے	اللّٰهُ :اللہ نے
وَعْدَهٗ :اپنے وعدے کو	اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ :جب تم لوگ قتل کرتے تھے ان کو
بِاِذْنِهٖ :اس کی اجازت سے	حَتّٰى :یہاں تک کہ
اِذَا فَشِلْتُمْ :جب تم لوگوں نے بزدلی کی	وَتَنَازَعْتُمْ :اور باہم اختلاف کیا
فِي الْاَمْرِ :اس فیصلے میں	وَعَصَيْتُمْ :اور تم نے حکم عدولی کی
مِّنْۢ بَعْدِ مَآ :اس کے بعد کہ جو (یعنی جب)	اَرٰىكُمْ :اس نے دکھایا تم کو
مَّا :وہ' جو	تُحِبُّوْنَ :تم لوگ پسند کرتے ہو
مِنْكُمْ مَّنْ :تم میں وہ بھی ہیں جو	يُرِيْدُ :ارادہ کرتے ہیں
الدُّنْيَا :دنیا کا	وَمِنْكُمْ مَّنْ :اور تم میں وہ بھی ہیں جو
يُرِيْدُ :ارادہ کرتے ہیں	الْاٰخِرَةَ :آخرت کا
ثُمَّ :پھر	صَرَفَكُمْ :اُس نے پھیرا تم کو
عَنْهُمْ :ان سے	لِيَبْتَلِيَكُمْ :تاکہ وہ آزمائش میں ڈالے تم کو

وَلَقَدْ عَفَا :اور یقیناً اس نے درگزر کیا ہے	عَنْكُمْ :تم لوگوں سے
وَاللّٰهُ :اور اللہ	ذُوْ فَضْلٍ :فضل (کرنے) والا ہے
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ :مؤمنوں پر	اِذْ تُصْعِدُوْنَ :جب تم دوڑتے جاتے تھے
وَلَا تَلْوٗنَ :اور نہیں گھماتے تھے (اپنی گردنوں کو)	عَلٰٓى اَحَدٍ :کسی ایک پر
وَّالرَّسُوْلُ :حالانکہ یہ رسولؐ	يَدْعُوْكُمْ :بلاتے تھے تم کو
فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ :تمہارے دوسرے (گروہ) میں	فَاَثَابَكُمْ :تو اُس نے بدلے میں دیا تم کو
غَمًّا بِغَمٍّ :غم پر غم	لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا :تاکہ تم لوگ مت پچھتاؤ
عَلٰى مَا :اس پر جو	فَاتَكُمْ :نکل گیا تم سے
وَلَا مَآ :اور نہ اس پر جو	اَصَابَكُمْ :آ لگا تم کو
وَاللّٰهُ :اور اللہ	خَبِيْرٌ :باخبر ہے
بِمَا :اس سے جو	تَعْمَلُوْنَ :تم لوگ کرتے ہو

آیت ۱۵۴

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾

ن ع س

نَعَسَ (ف) نَعْسًا :اُونگھنا' حواس کا سست ہونا۔

نُعَاسٌ (اسم ذات) :اُونگھ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ض ج ع

ضَجَعَ (ف) ضَجْعًا :پہلو کے بل لیٹنا۔

مَضْجَعٌ' ج مَضَاجِعُ (اسم الظرف) : (۱) لیٹنے کی جگہ (۲) قتل گاہ۔ ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي

اَلْمَضَاجِعِ﴾(النساء:٣٤) ''اورتم لوگ قطع تعلق کروان سے لیٹنے کی جگہوں میں۔''

غ ش و

غَشِیَ (س) غَشَاوَۃً : کسی کا کسی پر چھا جانا' ڈھانپ لینا۔آیت زیر مطالعہ۔

غِشَاوَۃٌ (اسم ذات) : پردہ۔﴿وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ﴾(البقرۃ:٧)''اوران کی بصارت پر ایک پردہ ہے۔''

غَاشِیَۃٌ (اسم الفاعل) : ڈھانپنے والی' چھا جانے والی۔ ﴿ھَلْ اَتٰـکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ﴾ (الغاشیۃ) ''کیا پہنچی تجھ کو چھا جانے والی کی خبر۔''

غَاشٍ ج غَوَاشٍ (اسم الفاعل) : چھا جانے والا' لیکن اسم ذات کے طور پر بھی آتا ہے۔اوڑھنے کی چیز' اوڑھنا۔﴿لَھُمْ مِّنْ جَھَنَّمَ مِھَادٌ وَّمِنْ فَوْقِھِمْ غَوَاشٍ﴾ (الاعراف:٤١)''ان کے لیے جہنم میں سے ایک بچھونا ہے اوران کے اوپر سے کچھ اوڑھنے ہیں۔''

اَغْشٰی (افعال) اِغْشَاءً : کسی پر کسی چیز کو چھا دینا' ڈھانپ دینا۔﴿یُغْشِی الَّـیْلَ النَّھَارَ﴾ (الاعراف:٥٤) ''وہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن سے۔''

غَشّٰی (تفعیل) تَغْشِیَۃً : بتدریج کسی چیز پر کسی چیز کو چھا دینا' ڈھانپ دینا۔﴿فَغَشّٰھَا مَا غَشّٰی﴾ (النجم) ''تو اس نے چھایا اس پر اس کو جو اس نے چھایا۔''

تَغَشّٰی (تفعّل) تَغَشٍّ :بتکلف کسی پر چھا جانا' ڈھانپ لینا۔﴿فَلَمَّا تَغَشّٰھَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا﴾ (الاعراف:١٨٩) ''پھر جب اُس نے ڈھانپ لیا اس کو تو اس نے اٹھایا ایک ہلکا حمل۔''

اِسْتَغْشٰی (استفعال) اِسْتِغْشَاءً : کسی چیز سے خود کو ڈھانپنا۔﴿حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ﴾ (ھود:٥) ''جس وقت وہ لوگ خود کو ڈھانپتے ہیں اپنے کپڑوں سے۔''

ترکیب : ''اَنْزَلَ'' کا مفعول ''اَمَنَۃً'' ہے۔''نُعَاسًا'' اس کا بدل ہے اور نکرہ مخصوصہ ہے۔''یَغْشٰی'' کا فاعل اس میں ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو ''نُعَاسًا'' کے لیے ہے اور ''طَائِفَۃً'' اس کا مفعول ہے۔''طَائِفَۃٌ'' مبتدأ نکرہ ہے اور آگے جملہ فعلیہ اس کی خبر ہے جبکہ ''اَھَمَّتْ'' کا فاعل ''اَنْفُسُھُمْ'' ہے۔''اِنَّ الْاَمْرَ'' پر لامِ جنس ہے اور ''کُلَّہٗ'' اس کا بدل ہے۔''شَیْءٌ'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور یہ ''کَانَ'' کا اسم ہے۔اس کی خبر محذوف ہے۔''لَنَا مِنَ الْاَمْرِ'' قائم مقام خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ ''لَـوْ'' کی شرط ہے اور ''مَا قُتِلْـنَا ھٰھُنَا'' جوابِ شرط ہے۔''لَـوْ کُنْتُمْ'' کا ''لَـوْ'' بھی شرطیہ ہے۔''اَلَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ'' صلہ موصول مل کر ''لَـبَرَزَ'' کا فاعل ہے اور ''اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ'' متعلق فعل ہے ''لَـبَرَزَ'' کا۔

ترجمہ:

ثُمَّ : پھر   اَنْزَلَ : اُس نے اُتارا

عَلَيْكُمْ :تم لوگوں پر
اَمَنَةً :ایک اطمینان
يَّغْشٰى :جو چھاتی تھی
مِّنْكُمْ :تم میں سے
قَدْ اَهَمَّتْهُمْ :بے چین کیا تھا اُن کو
يَظُنُّوْنَ :وہ لوگ گمان کرتے تھے
غَيْرَ الْحَقِّ :حق کے بغیر
يَقُوْلُوْنَ :وہ لوگ کہتے تھے
لَّنَا ہمارے لیے ہے
مِنْ شَيْءٍ :کوئی بھی چیز
اِنَّ الْاَمْرَ :بے شک فیصلہ
لِلّٰهِ :اللہ کے لیے ہے
فِيْ اَنْفُسِهِمْ :اپنے جی میں
لَا يُبْدُوْنَ :وہ لوگ ظاہر نہیں کرتے
يَقُوْلُوْنَ وہ لوگ کہتے ہیں
لَنَا :ہمارے لیے
شَيْءٌ :کچھ
هٰهُنَا :یہاں
لَوْ كُنْتُمْ :اگر تم لوگ ہوتے
لَبَرَزَ تو ضرور نکلتے
كُتِبَ :لکھا گیا
الْقَتْلُ :قتل کیا جانا
وَلِيَبْتَلِيَ :اور تا کہ آزمائش میں ڈالے
مَا :اس کو جو
وَلِيُمَحِّصَ :اور تا کہ وہ نکھار دے
فِيْ قُلُوْبِكُمْ :تمہارے دِلوں میں ہے
عَلِيْمٌ :جاننے والا ہے

مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ :اس بے چینی کے بعد
نُّعَاسًا :جو ایک ایسی اونگھ تھی
طَآئِفَةً :ایک گروہ پر
وَطَآئِفَةٌ :اور ایک دوسرا گروہ تھا
اَنْفُسُهُمْ :ان کی جانوں نے
بِاللّٰهِ :اللہ سے
ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ :غلط سوچ کا گمان
هَلْ :کیا
مِنَ الْاَمْرِ :اس فیصلے میں سے
قُلْ :آپؐ کہہ دیجیے
كُلَّهٗ :اس کا کل
يُخْفُوْنَ :وہ لوگ چھپاتے ہیں
مَّا :اس کو جو
لَكَ آپؐ کے لیے
لَوْ كَانَ :اگر ہوتا
مِنَ الْاَمْرِ :اس فیصلے میں سے
مَّا قُتِلْنَا :تو ہم قتل نہ کیے جاتے
قُلْ :آپؐ کہہ دیجیے
فِيْ بُيُوْتِكُمْ :اپنے گھروں میں
الَّذِيْنَ :وہ لوگ
عَلَيْهِمُ :جن پر
اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ :اپنی قتل گاہ کی طرف
اللّٰهُ :اللہ
فِيْ صُدُوْرِكُمْ :تمہارے سینوں میں ہے
مَا :اس کو جو
وَاللّٰهُ :اور اللہ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ :سینوں والی (بات) کو

نوٹ: البقرۃ:۱۷۴ کی لغت میں مادہ ''ق ت ل'' کے مصدر قَتْلٌ کے معنی ''قتل کرنا'' بتایا گیا ہے جبکہ اس آیت میں اس کے معنی ''قتل کیا جانا'' کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ لیں۔ اس کے فعل معروف قَتَلَ . یَقْتُلُ کا مصدر قَتْلٌ ہے اور فعل مجہول قُتِلَ . یُقْتَلُ کا مصدر بھی ''قَتْلٌ'' ہے۔ اس لیے ''قَتْلٌ'' معروف اور مجہول دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی صورت حال تمام متعدی افعال میں ہے۔ ان کے افعال معروف اور مجہول میں تو اوزان کے مطابق تبدیلی ہوتی ہے لیکن مصدر میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لیے متعدی افعال کے مصادر معروف اور مجہول دونوں معانی میں آتے ہیں۔

آیات ۱۵۵، ۱۵۶

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَقَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ کَانُوۡا غُزًّی لَّوۡ کَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا قُتِلُوۡا ۚ لِیَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِکَ حَسۡرَةً فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝﴾

غ ز و

غَزَا (ن) غَزْوًا: جنگ کے لیے نکلنا، حملہ کرنا۔

غَازٍی، ج غُزًّی (اسم الفاعل) : جنگ کرنے والا، آیت زیر مطالعہ۔

غَزْوَةٌ، ج غَزَوَاتٌ (اسم ذات): جنگ، حملہ۔ اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ اب صرف ایسی مہم کے لیے مخصوص ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے بنفس نفیس شرکت کی ہو۔ یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

ترکیب : ''یَوْمَ'' ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ''اِلْتَقٰی'' کا فاعل ''اَلْجَمْعٰنِ'' ہے، اس لیے رفعی حالت میں ہے۔ ''اِذَا'' شرطیہ نہیں ہے اس لیے یہ ''اِذْ'' کے معنی میں ہے۔ ''ضَرَبُوْا'' کی ضمیر فاعلی ''هُمْ'' اور ''کَانُوْا'' کے اسم کی ضمیر ''هُمْ'' یہ دونوں ''لِاِخْوَانِهِمْ'' کے لیے ہیں۔ ''لِیَجْعَلَ'' کا مفعولِ اوّل ''ذٰلِکَ'' ہے اور مفعول ثانی ''حَسْرَةً'' ہے۔

ترجمہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ : بے شک جن لوگوں نے	تَوَلَّوۡا : منہ موڑا
مِنۡکُمۡ : تم میں سے	یَوۡمَ : جس دن
الۡتَقَی : آمنے سامنے ہوئیں	الۡجَمۡعٰنِ : دو جماعتیں

اِنَّمَا :(تو) کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	اسْتَزَلَّهُمُ: پھسلانے کی کوشش کی ان کو
الشَّيْطٰنُ : شیطان نے	بِبَعْضِ مَا :بعض اُس کے سبب سے جو
كَسَبُوْا :انہوں نے کمایا	وَلَقَدْ عَفَا:اور یقیناً درگزر کر چکا ہے
اللّٰهُ :اللہ	عَنْهُمْ:ان سے
اِنَّ :یقیناً	اللّٰهَ :اللہ
غَفُوْرٌ :بخشنے والا ہے	حَلِيْمٌ :بردبار ہے
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ لوگو جو	اٰمَنُوْا :ایمان لائے
لَا تَكُوْنُوْا:تم لوگ مت ہو جانا	كَالَّذِيْنَ :ان کی مانند جنہوں نے
كَفَرُوْا :کفر کیا	وَقَالُوْا:اور کہا
لِاِخْوَانِهِمْ :اپنے بھائیوں کے لیے	اِذَا :جب
ضَرَبُوْا :وہ لوگ نکلے	فِي الْاَرْضِ :زمین میں
اَوْ :یا	كَانُوْا :وہ لوگ تھے
غُزًّى :جنگ کرنے والے	لَوْ:(کہ) اگر
كَانُوْا :وہ لوگ ہوتے	عِنْدَنَا :ہمارے پاس
مَا مَاتُوْا :تو وہ نہ مرتے	وَمَا قُتِلُوْا:اور نہ ہی وہ قتل کیے جاتے
لِيَجْعَلَ :(یہ اس لیے) کہ بنائے	اللّٰهُ :اللہ
ذٰلِكَ اس کو	حَسْرَةً :ایک حسرت
فِيْ قُلُوْبِهِمْ:ان کے دلوں میں	وَاللّٰهُ :اور اللہ
يُحْيٖ :زندگی دیتا ہے	وَيُمِيْتُ :اور وہ (ہی) موت دیتا ہے
وَاللّٰهُ :اور اللہ	بِمَا :اس کو جو
تَعْمَلُوْنَ:تم لوگ کرتے ہو	بَصِيْرٌ: دیکھنے والا ہے

نوٹ: ''تَوَلَّوْا مِنْكُمْ'' میں اشارہ ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف ہے جو میدانِ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر پسپا ہو رہے تھے لیکن اس کی تردید سن کر واپس آ گئے اور جنگ میں شرکت کی۔ اسی لیے یہاں فعل ''زَلَّ'' (بلا ارادہ پھسل جانا) باب استفعال سے آیا ہے۔

آیات ۱۵۷ تا ۱۵۹

﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾

ل ی ن

لَانَ (ض) لَيْنًا: نرم ہونا' آیت زیر مطالعہ۔

لَيِّنٌ (صفت): نرم' ملائم۔ ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ:٤٤) ''تو تم دونوں کہنا اس سے نرم بات۔''

لِيْنَةٌ (اسم ذات): کھجور کا درخت (عجوہ کھجور کے علاوہ)۔ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً﴾ (الحشر:٥) ''جو تم لوگوں نے کاٹا کسی کھجور کے درخت میں سے یا چھوڑا اس کو کھڑا ہوا۔''

اَلَانَ (افعال) اِلَانَةً: نرم کرنا۔ ﴿وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ﴾ (سبا:١٠) ''اور ہم نے نرم کیا اس کے لیے لوہے کو۔''

ف ظ ظ

فَظَّ (س) فِظَاظًا: بدمزاج ہونا۔

فَظٌّ: بدمزاج' آیت زیر مطالعہ۔

غ ل ظ

غَلَظَ (ن) وَ غَلُظَ (ک) غِلْظَةً: موٹا ہونا' گاڑھا ہونا' سخت ہونا۔

غِلْظَةٌ (اسم ذات بھی ہے): موٹا پن' سختی۔ ﴿وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبة:١٢٣) ''اور چاہیے کہ وہ لوگ پائیں تم لوگوں میں سختی۔''

اُغْلُظْ: تو سخت ہو۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (التوبة:٧٣) ''اے نبیؐ آپؐ جہاد کریں کافروں اور منافقوں سے اور آپؐ سخت ہوں ان پر۔''

غَلِيْظٌ ج غِلَاظٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): گاڑھا' سخت۔ ﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ (التحریم:٦) ''اس پر فرشتے ہیں انتہائی سخت۔''

اِسْتَغْلَظَ (استفعال) اِسْتِغْلَاظًا: موٹا پن یا سختی چاہنا' یعنی موٹا ہونا' سخت ہونا۔ ﴿فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ (الفتح:٢٩) ''پھر وہ یعنی کھیتی موٹی ہوئی پھر وہ جمی اپنی پنڈلی پر۔''

ترکیب: ''لَمَغْفِرَةٌ'' اور ''رَحْمَةٌ'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہیں۔ ''خَيْرٌ'' ان کی خبر ہے۔ اور یہ جملہ ''لَئِنْ'' کا جواب شرط ہے۔ ''لَاِالٰى'' میں ایک الف زیادہ لکھنا قرآن مجید کا مخصوص املا ہے۔ ''كُنْتَ'' کی خبر اوّل ''فَظًّا'' ہے اور ''غَلِيْظَ الْقَلْبِ'' خبر ثانی ہے' اس لیے ''غَلِيْظَ'' منصوب ہے۔ ''لَانْفَضُّوْا'' جواب شرط

ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

ترجمہ:

وَلَئِنْ :اوراگر	قُتِلْتُمْ :تم لوگ قتل کیے جاتے ہو
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ :اللہ کی راہ میں	اَوْ مُتُّمْ :یا مرتے ہو
لَمَغْفِرَۃٌ: تو یقیناً مغفرت	مِّنَ اللّٰہِ :اللہ(کی طرف) سے
وَرَحْمَۃٌ :اوررحمت	خَیْرٌ :بہتر ہے
مِّمَّا :اس سے جو	یَجْمَعُوْنَ :یہ لوگ جمع کرتے ہیں
وَلَئِنْ :اوراگر	مُتُّمْ :تم لوگ مرتے ہو
اَوْ قُتِلْتُمْ :یا قتل کیے جاتے ہو	لَاِالَی اللّٰہِ :تو اللہ کی طرف ہی
تُحْشَرُوْنَ :اکٹھا کیے جاؤ گے	فَبِمَا رَحْمَۃٍ :تو اس رحمت کے سبب سے جو
مِّنَ اللّٰہِ :اللہ(کی طرف) سے ہے	لِنْتَ :آپؐ نرم ہوئے
لَھُمْ :ان کے لیے	وَلَوْ کُنْتَ:اوراگر آپؐ ہوتے
فَظًّا :بدمزاج	غَلِیْظَ الْقَلْبِ :دل کے سخت
لَانْفَضُّوْا: تو یقیناً یہ لوگ منتشر ہو جاتے	مِنْ حَوْلِکَ آپؐ کے اردگرد سے
فَاعْفُ :پس آپؐ درگزر کریں	عَنْھُمْ :ان سے
وَاسْتَغْفِرْ :اورآپؐ مغفرت مانگیں	لَھُمْ:ان کے لیے
وَشَاوِرْ :اورآپؐ رائے لیں	ھُمْ :ان سے
فِی الْاَمْرِ :فیصلے میں	فَاِذَا : پھر جب
عَزَمْتَ :آپؐ پختہ ارادہ کرلیں	فَتَوَکَّلْ :تو آپؐ توکل کریں
عَلَی اللّٰہِ :اللہ پر	اِنَّ اللّٰہَ :بے شک اللہ
یُحِبُّ :پسند کرتا ہے	الْمُتَوَکِّلِیْنَ :توکل کرنے والوں کو

نوٹ: رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ اہم معاملات میں آپؐ صحابہ کرامؓ کی رائے لیتے تھے۔ یہاں آیت ۱۵۹ میں آپؐ کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت ان لوگوں کی رائے بھی معلوم کرلیا کریں جو بظاہر مسلمان لیکن حقیقتاً منافق تھے۔ اس کے علاوہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ میں اہل ایمان کی ایک صفت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ ان کے فیصلے باہمی مشورے سے ہوتے ہیں۔ ان دو مقامات سے اسلامی نظام میں مشاورت کے متعلق جو راہنمائی حاصل ہوتی ہے' اس پر معارف القرآن میں مفتی محمد شفیعؒ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) قرآن وحدیث کے واضح احکام میں مشورہ کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً زکوٰۃ دے یا نہیں، حج کرنے جائے یا نہیں، وغیرہ۔ البتہ اس میں مشورہ کیا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ کو کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کیا جائے، یا حج کے لیے بحری جہاز سے جائے یا ہوائی جہاز سے، کیونکہ یہ شرعاً اختیاری امور ہیں۔

(۲) اختیاری امور میں مشورہ کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔ اسے چاہیے کہ وہی رائے دے جو اس کام میں وہ خود اپنے لیے تجویز کرتا ہے۔ اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔

(٤) اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے جس میں امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے، خاندانی وراثت سے نہیں۔ اسلام نے حکومت میں وراثت کا اصول ختم کر کے امیر مملکت مقرر یا معزول کرنا جمہور کے اختیار میں دے دیا۔

(۵) منتخب امیر مطلق العنان نہیں ہے بلکہ مشورہ لینے کا پابند ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ شورائیت کے بغیر خلافت نہیں ہے۔

(٦) قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث اور تعامل صحابہؓ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلافِ رائے کی صورت میں امیر کسی ایک صورت کو اختیار کرسکتا ہے، خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے۔ ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ﴾ میں واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے، عَزَمْتُمْ جمع کا صیغہ نہیں آیا۔ اس اشارہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ لینے کے بعد عزم اور نفاذ صرف امیر کا معتبر ہے۔

(۷) سب تدبیریں کرنے کے بعد نتیجے کے لیے بھروسہ اور تکیہ صرف اللہ پر کرو۔

۞۞۞

رحمتِ الٰہی کی وسعت

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((**اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَاتِ، ثُمَّ بَیَّنَ ذٰلِکَ: فَمَنْ ھَمَّ بِحَسَنَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ لَہٗ عِنْدَہٗ حَسَنَۃً کَامِلَۃً، فَاِنْ ھُوَ ھَمَّ بِھَا فَعَمِلَھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ لَہٗ عِنْدَہٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰی سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ اِلٰی اَضْعَافٍ کَثِیْرَۃٍ، وَمَنْ ھَمَّ بِسَیِّئَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ لَہٗ عِنْدَہٗ حَسَنَۃً کَامِلَۃً، فَاِنْ ھُوَ ھَمَّ بِھَا فَعَمِلَھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ سَیِّئَۃً وَاحِدَۃً**)) (متفق علیہ)

حضرت ابن عباس ؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا حکم دیا' اس طرح پر کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک پوری نیکی شمار کر لیتا ہے' اور جو شخص نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل کرے اس کے حساب میں ایک نیکی کے بدلہ میں دس نیکیاں بلکہ سات سو نیکیاں اور اس سے بھی زیادہ لکھی جاتی ہیں' اور جو شخص برائی کا ارادہ کرے اور برائی کو عمل میں نہ لا سکے (خدا کے خوف سے یا کسی اور وجہ سے) تو خداوند تعالیٰ اپنے ہاں اس کے حساب میں ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے' اور جو شخص برائی کا ارادہ کر کے اس کو عمل میں بھی لائے تو صرف ایک برائی اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے''۔ (بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی ذات میں بے مثل اور بے مثال ہے اسی طرح اُس کی ہر صفت ازلی و ابدی اور لامحدود ہے۔ تاہم اُس کی صفتِ رحمت سب سے بڑھ کر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿**وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ**﴾ (الاعراف:۱۵۶) ''میری رحمت وسیع ہے ہر شے پر''۔ حاملینِ عرش مؤمنین کے حق میں اللہ کے حضور بخشش کی دعا کرتے وقت کہتے ہیں:

﴿**رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَۃً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا**.....﴾ المؤمن:۷)

اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے' بس تو بخش دے ان لوگوں کو جو توبہ کریں.....''

بخاری اور مسلم کی زیر درس حدیث بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے

اُس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے اگرچہ وہ شخص اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکے۔ اور اگر وہ اپنے ارادے کے مطابق نیک کام کر لے تو اُس کو دس نیکیوں کے برابر بلکہ سات سو یا سات سو سے بھی زیادہ نیکیوں کا ثواب دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جاتی، بلکہ اگر وہ برائی کے ارادے پر عمل نہیں کرتا تو اُس کو ایک نیکی کا ثواب ملتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے برے ارادے کے مطابق برائی کر گزرے تو اُس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک ہی برائی درج کی جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، وہ اپنے بندوں کی خطائیں معاف کرنا چاہتا ہے اور نیک کاموں پر زیادہ سے زیادہ ثواب دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝﴾ (الانعام)

''جو کوئی ایک نیکی لاتا ہے اُس کے لیے دس گنا اجر ہے، اور جو کوئی ایک برائی لاتا ہے تو اس کو بس اسی کی جزا ملے گی اور لوگوں پر ظلم نہیں جائے گا''۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، بس اس کی رحمت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہے۔ ؎

رحمت حق بہا نمی جوید
رحمت حق بہانہ می جوید

جو شخص بڑا گناہگار ہو، پھر اس کو ندامت ہو، توبہ کرے اور آئندہ کے لیے گناہوں سے باز رہنے کا پختہ ارادہ کر کے اللہ کے حضور معافی چاہے، تو ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قدر برستی ہے کہ اُس کی برائیاں نیکیوں میں تبدیل کر دی جاتی ہیں۔ الفاظِ قرآنی: ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الزمر:۵۳) ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو'' کا یہی مطلب ہے کہ کوئی گناہگار اپنے بے حساب گناہوں پر نظر ڈال کر رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہو، بلکہ اگر وہ خلوص کے ساتھ اللہ کو پکارے گا تو اللہ کی بے پایاں رحمت سے نوازا جائے گا۔ ؎

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ !

سورۃ الفرقان میں کبیرہ گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں بدل دے گا، اور اللہ تو بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں' ان میں سے ایک رحمت اُس نے جن' انسان' چارپایوں اور زہریلے جانوروں میں بھیجی ہے' اس رحمت کے سبب سے وہ آپس میں پیار محبت اور مہربانی کرتے ہیں' جبکہ ننانوے (۹۹) رحمتوں کو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے لیے اٹھا رکھا ہے کہ وہ ان سے اس دن اپنے بندوں پر رحم کرے گا۔ (بخاری و مسلم)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے سورۃ الرحمٰن کی آیت: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ♦﴾ پڑھی کہ ''جو شخص اپنے پروردگار کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرا اُس کو دو جنتیں ملیں گی''۔ صحابیٔ رسول حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو؟ آپؐ نے یہ سن کر پھر وہی آیت پڑھی۔ ابودرداءؓ نے پھر پوچھا اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے پھر وہی آیت پڑھی۔ تیسری مرتبہ ابودرداءؓ نے پھر پوچھا یارسول اللہ اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگرچہ ابودرداء کی ناک خاک آلود ہو''۔ (احمد)

گویا گناہگار سے گناہگار شخص کے گناہ بھی اللہ کی رحمت کے سامنے بے حیثیت ہیں۔

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص جس نے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا تھا' موت کے وقت اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا دینا۔ پھر آدھی راکھ جنگل میں اُڑا دینا اور آدھی دریا میں بہا دینا۔ خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھ پر قابو پالیا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جیسا دنیا میں پہلے کسی کو نہ دیا ہوگا۔ جب وہ بندہ مرگیا تو اُس کے بیٹوں نے اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا اور اس کے اندر کی راکھ جمع کی' پھر جنگل کو حکم دیا اور اُس کے اندر کی راکھ جمع کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا: پروردگار تیرے خوف سے' اور تو یہ بات خوب جانتا ہے۔ اس پر اللہ نے اسے بخش دیا۔ (عن ابی ہریرہ) اگرچہ اس شخص کی وصیت غلط تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس خوف کی وجہ سے اُسے بخش دیا جو اسے قیامت کے دن اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے تھا۔ پس اللہ تعالیٰ سے خوف کھانا اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتا ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو ایک کتاب لکھی جو اس کے پاس عرش پر موجود ہے۔ اس کتاب میں یہ الفاظ ہیں: ((اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ)) ''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی''۔ (عن ابی ہریرہؓ)

گویا اللہ کی رحمت کی کوئی حد نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے جتنی ایک ماں کو اپنے بچے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ جب ایک عورت کو اپنے بچے کے ساتھ والہانہ محبت کرتے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''اللہ اپنے بندوں پر اس

سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے''۔(صحیحین، عن عمر بن الخطابؓ)

انسانوں کا پروردگار اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے، پھر بھی انسان اپنی بری روش، سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے عذاب کا مستحق بن جائے تو اس سے بڑی بدبختی اور محرومی اور کیا ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم کسی غزوے میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ایک جماعت کے قریب سے گزرے اور پوچھا تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہم مسلمان ہیں۔ اس جماعت میں ایک عورت ہانڈی پکا رہی تھی اور اس کا بیٹا اس کے پاس تھا۔ جب آگ کا شعلہ بلند ہوتا تو عورت لڑکے کو پیچھے ہٹا لیتی۔ پھر عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: کیا آپؐ خدا کے رسول ہیں؟ فرمایا: ''ہاں''۔ عورت نے پوچھا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! کیا اللہ بہت رحم کرنے والا نہیں؟ فرمایا: ''ہاں''۔ عورت نے کہا: اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا نہیں ہے جتنا کہ ایک ماں اپنے بچوں پر رحم کرتی ہے؟ فرمایا: ''ہاں''۔ عورت نے کہا ماں تو اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالتی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے سر جھکا لیا اور روتے رہے۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر عذاب نہیں کرتا سوائے ان لوگوں پر جو سرکش ہیں، یعنی اللہ سے سرکشی کرتے ہیں اور اس کا حکم نہیں مانتے اور لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کرتے ہیں''۔(ابن ماجہ)

جن احادیث میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور مغفرت کا مطلق ذکر ہے وہاں یہ بات مسلم ہوتی ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا وہ گناہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر دوٹوک انداز میں فرمادیا ہے کہ شرک اللہ کے نزدیک ناقابل بخشش گناہ ہے۔ پس کسی انسان کا اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور بخشش کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوجانا بھی عین ممکن ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور مغفرت کا امیدوار ہونے کے لیے لازم ہے کہ بندہ اپنے کو اس کا اہل بنانے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو مانے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی کوشش کرے۔ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والے کام نہ کرے۔ استغفار کو اپنا شعار بنائے۔ شرکیہ اُمور سے سخت اجتناب کرے، کیونکہ شرک بندے کو اللہ کی بے پایاں رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ خود قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ (المائدۃ:۷۲) ''بے شک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا پس حرام کی اللہ نے اُس پر جنت اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔'' ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبلؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گدھے پر سوار تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے معاذ! بندوں پر خدا کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، اور خدا پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جو شخص اس کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے وہ اس کو عذاب نہ دے۔'' (بخاری و مسلم)

(باقی صفحہ 51 پر)

آسمان سے بارش تو یکساں ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنا برتن سیدھا رکھا ہوتا ہے اُس کو پانی مل جاتا ہے مگر اُسی بارش میں جس شخص نے اپنا برتن الٹا رکھے رکھا وہ بارش کا ایک قطرہ بھی حاصل نہ کر سکے گا۔ اب اگر یہ نادان شکایت کرے کہ اتنی بارش ہوئی مگر مجھے تو ایک قطرہ پانی بھی نہیں ملا تو اس کی یہ شکایت انتہائی لغو ہوگی۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اپنے عقیدے اور عمل کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ ساری عمر خواہش نفس کے پیچھے لگا رہا۔ شرکیہ امور انجام دیتا رہا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت سے محروم رہا۔ اللہ کی رحمت تو انسان کو پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارا پروردگار روزانہ رات کے آخری تہائی حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اس کے سوال کو پورا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے اور میں اس کو بخش دوں؟'' (بخاری و مسلم)

۞۞۞

اختلافِ مطالع کا اعتبار و عدم اعتبار

وطن عزیز میں رمضان و عید کے موقع پر رؤیتِ ہلال کا مسئلہ اکثر و بیشتر مابہ النزاع صورت اختیار کر لیتا ہے' چنانچہ صوبہ سرحد میں سرکاری رؤیت ہلال کمیٹی کے اعلان سے ایک روز قبل رمضان و عید کا چاند نظر آنے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ مکہ مکرمہ کی رؤیت کا اعتبار کرتے ہوئے سعودی عرب کے ساتھ روزہ رکھنے اور عید منانے کا باضابطہ فیصلہ کر لیا جائے۔ اس ضمن میں ہمیں بھی متعدد خطوط موصول ہوئے کہ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کی جائے۔ ان خطوط کے جواب میں قرآن اکیڈمی کے شعبہ تحقیق اسلامی کی جانب سے جو جواب مرتب کر کے ارسال کیا گیا' وہ قارئین حکمت قرآن کے استفادے کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

صوم میں اختلافِ مطالع صرف شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے' باقی ائمہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ حنفیہ' مالکیہ اور حنابلہ کا اتفاق ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں' بلکہ اہل مغرب کی رؤیت سے اہل مشرق پر روزہ فرض ہو جائے گا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایسے بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع معتبر ہونا چاہیے جن کی رؤیت میں ایک دن سے زیادہ فرق ہو' اس لیے کہ اس صورت میں مہینہ کے ایام انتیس سے کم یا تیس سے زیادہ ہو جائیں گے اور یہ نصوصہ صریحہ کے خلاف ہے۔ یہ خیال اس لیے صحیح نہیں کہ نئی تحقیق کے مطابق پوری دنیا میں ایک دن سے زیادہ فرق ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کہیں ہوتا ہے تو اس کا سبب اختلافِ مطالع نہیں بلکہ عوارضِ فضائیہ وغیرہ پر مبنی ہے۔

قال فی التنویر واختلاف المطالع غیر معتبر علی المذهب و قال فی العلائیة وعلیه أکثر المشائخ و علیه الفتوی ..... وفی الشامیة وانما الخلاف فی اعتبار اختلاف المطالع بمعنی انه هل یجب علی کل قوم اعتبار مطلعهم ولا یلزم احدًا العمل بمطلع غیره أم لا یعتبر اختلافها بل یجب العمل بالاسبق رؤیةً حتی لورؤی فی المشرق لیلة الجمعة وفی المغرب لیلة السبت وجب علی اهل المغرب العمل بمارآه اهل المشرق فقیل بالأول و اعتمده الزیلعی وصاحب الفیض وهو الصحیح عند الشافعیة لأن کل قوم مخاطبون بما عند هم کما فی اوقات الصلوة..... وظاهر الروایة الثانی وهو المعتمد عندنا وعند المالکیة و عند

الحنابلة لتعلق الخطاب عاما بمطلق الرؤية فی حدیث ((صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِہٖ)) بخلاف اوقاتِ الصلوٰۃ. (رد المحتار ۱۳۲/۲)

''تنویر الابصار میں ہے کہ مطالع کا اختلاف مذہب (حنفی) میں معتبر نہیں اور علائیہ میں ہے کہ اکثر مشائخ کا اسی پر عمل ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اور فتاویٰ شامیہ میں ہے کہ مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنے میں اختلاف ہے، یعنی کیا ہر قوم پر اپنے مطلع کا اعتبار کرنا واجب اور دوسروں کے مطلع پر عمل کرنا لازم نہیں؟ یا اس کے برعکس کہ مطالع کا اختلاف معتبر نہیں، بلکہ جہاں پہلے چاند دیکھا گیا اس پر سب کو عمل کرنا لازم ہے۔ حتیٰ کہ اگر مشرق میں جمعہ کی رات چاند نظر آیا اور مغرب میں ہفتہ کی رات تو اہل مغرب کو اہل مشرق کی رؤیت پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ پہلا قول (اختلافِ مطالع کے معتبر ہونے کا) حافظ زیلعی، صاحب فیض اور شوافع کا ہے۔ ان کے خیال میں ہر قوم اپنے اپنے مطلع کی پابند ہے، جیسا کہ اوقاتِ صلوٰۃ میں۔ اور دوسرا قول اختلافِ مطالع کا معتبر نہ ہونا فقہ حنفی کی ظاہر الروایت ہے۔ اسی قول پر حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا اعتماد ہے، کیونکہ حدیث ((صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِہٖ)) میں خطاب عام ہے بخلاف اوقاتِ صلوٰۃ کے۔''

معلوم ہوا کہ حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک مطالع کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں۔ چنانچہ ایک شہر والوں کا چاند دیکھنا دوسرے شہر والوں پر بھی حجت ہے، خواہ ان دونوں شہروں میں کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ ابتدائے مغرب میں چاند دیکھا جائے اور اس کی خبر شرعی طور پر معتبر طریقہ سے انتہائے مشرق کے رہنے والوں تک پہنچ جائے تو ان پر اس دن کا روزہ ضروری ہوگا۔ لیکن اگر خبر پہنچنے کا قابل اعتبار شرعی طریقہ نہ ہو تو ہر ملک اپنے علاقہ میں اپنی رؤیت کے مطابق عمل کر سکتا ہے، بلکہ اگر ایک ملک میں بھی وہ خبر شرعی معتبر طریقہ سے نہ پہنچے تو ہر شہر اپنی رؤیت پر عمل کر سکتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

..... **عن کریب، أنَّ اُم الفضل بنت الحارث بعثته الی معاویة بالشام، قال: فقدمتُ الشام، فقضیتُ حاجتها، واسْتُهِلَّ علی رمضان وأنا بالشام، فرأیتُ الهلال لیلة الجمعة، ثم قدمتُ المدینة فی آخر الشهر، فسالنی عبد اللّٰه بن عباس، ثم ذکر الهلال فقال: متی رأیتم الهلال؟ فقلتُ رأیناه لیلة الجمعة، فقال: أنت رأیتهٗ؟ فقلت: نعم، ورآه الناس، وصاموا وصام معاویة، فقال: لکنا رأیناه لیلة السبت، فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلاثین اونرآه، فقلتُ أَولا تکتفی برؤیة معاویة و صیامه؟ فقال: لا، هکذا امرَنا رسولُ اللّٰه ﷺ.** (صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب بیان ان لکل بلد رؤیتهم وأنهم اذا رأوا الهلال ببلد لا یثبت حکمه لما بعد عنهم)

''حضرت کریب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اُمّ الفضل بنت الحارث نے انہیں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملک شام کسی کام کے لیے بھیجا۔ ملک شام پہنچ کر ان کا کام کیا کہ اتنے میں ملک شام ہی میں ماہ

رمضان کا چاند ہوگیا۔ جمعہ کی رات میں نے خود چاند دیکھا۔ ماہِ رمضان کے آخر میں جب میں مدینہ منورہ پہنچا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہوئے کہا کہ تم نے چاند کب دیکھا تھا؟ میں نے کہا جمعہ کی رات۔ پھر انہوں نے دوسرا سوال کیا کیا تم نے خود چاند دیکھا تھا؟ میں نے کہا کہ میں نے بھی دیکھا تھا اور میرے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ اور تمام لوگوں نے ہفتہ کے دن روزہ رکھا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا لہٰذا ہم تو تیس روزے پورے کریں گے یا (انتیس کی شام کو) اگر چاند نظر آ گیا (تب عید کریں گے) میں نے کہا کیا آپ کے لیے حضرت امیر معاویہؓ کی رؤیت اور ان کا روزے رکھنا کافی نہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا تھا۔''

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اگرچہ رمضان ختم ہونے سے پہلے حضرت کریب رضی اللہ عنہ کی گواہی سے ملک شام میں جمعہ کی رات چاند ہونے کا علم ہوگیا تھا' لیکن چونکہ صرف ایک گواہ کی شہادت تھی اس لیے انہوں نے دونوں علاقوں میں رمضان اور عید کی وحدت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

البتہ متاخرین حنفیہ میں سے حافظ زیلعی (فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی) نے کنز الحقائق کی شرح تبیین الحقائق (۳۱۲/۱) میں لکھا ہے کہ بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع ہمارے نزدیک معتبر ہے' لہٰذا بلادِ بعیدہ کی رؤیت کافی نہیں۔ متاخرین نے اسی قول پر فتویٰ دیا ہے۔

لیکن بلادِ بعیدہ اور قریبہ کی تفریق کا معیار کیا ہے؟ اس کی وضاحت کتب فقہ میں نہیں ہے البتہ علامہ شبیر احمد عثمانی نے **فتح المُلهم** شرح مسلم میں اس کا معیار یہ تجویز کیا ہے کہ جو بلاد اتنی دور ہوں کہ ان کے اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنے سے دو دن کا فرق پڑ جائے وہاں اختلافِ مطالع معتبر ہوگا۔ یعنی ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہ کے لیے کافی نہیں ہوگی' کیونکہ اگر ایسے بلادِ بعیدہ میں بھی اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو وہاں مہینہ یا تو اٹھائیس دن کا ہوگا یا اکتیس دن کا' جس کی شریعتِ مطہرہ میں کوئی نظیر نہیں۔ ان کے اصل الفاظ درج ذیل ہیں:

نعم ينبغي ان يعتبر اختلافها ان لزم منه التفاوت بين البلدتين بأكثر من يوم واحدٍ لأن النصوص مصرحة بكون الشهر تسعة و عشرين او ثلاثين فلا تقبل الشهاده ولا يعمل بها فيما دون اقل العدد ولا ازيد من اكثره (فتح الملهم ۱۱۳/۳)

علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے' جیسا کہ مفتی شفیع صاحب نے ''رویت ہلال'' ص ۵۸ میں نقل کیا ہے۔ لیکن محقق ابن الہمام نے ظاہر الروایۃ کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے ''**الاخذ بظاهر الرواية احوط**''۔ اور جیسا کہ علامہ شامی کے حوالے سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ **وهو (عدم اختلاف**

المطالع) المعتمد عندنا و عند المالكية والحنابلة، واليه ذهب الليث بن سعد.

خلاصہ یہ کہ اس مسئلہ میں فقہاءِ اُمت، صحابہ و تابعین اور بعد کے علماء کے تین مسلک ہو گئے۔ ایک یہ کہ اختلافِ مطالع کا ہر جگہ، ہر حال میں اعتبار کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی جگہ کسی حال میں اعتبار نہ کیا جائے، تیسرا یہ کہ بلادِ بعیدہ میں اعتبار کیا جائے، بلادِ قریبہ میں نہیں۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں طرح کا اختلاف فقہاءِ امت حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی چاروں فقہ کے فقہاء میں موجود ہے، فرق صرف کثرت و قلت کا ہے۔

ثبوتِ ہلال کے معتبر طرق

(۱) رویت عامہ: (یعنی عام لوگوں یا جمِ غفیر کا چاند دیکھنا) یہ رمضان وعید کے چاند کے ثبوت کا قطعی فیصلہ ہے۔ اس کے بعد قانونی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۲) شہادت: اگر مطلع ابر آلود ہو جس کی وجہ سے رویت عامہ نہ ہو سکے تو ثبوتِ رمضان کا فیصلہ ایک متقی پابندِ شریعت مسلمان مرد یا عورت کے بیان پر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ عید کے چاند کے لیے باقاعدہ شہادت کی ضرورت ہے یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں (مسلمان بظاہر پابندِ شریعت) قاضی یا مفتی کے سامنے چاند دیکھنے کی شہادت دیں اور قاضی و مفتی ان کی شہادت قبول کر لیں تو چاند کا ثبوت ہو جاتا ہے۔

(۳) شہادت علی الشہادۃ: جبکہ اصل شاہدین کسی وجہ سے مجلس قضا میں یا کمیٹی کے روبرو حاضر ہونے سے قاصر ہوں تو وہ اپنی طرف سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا کر مجلس قضا یا مفتی یا کمیٹی کے روبرو شہادت کا فریضہ انجام دینے کے لیے بھیج دیں۔ وہ دونوں گواہ قاضی، مفتی یا کمیٹی کے سامنے حاضر ہو کر شہادت دیں کہ ہمارے سامنے فلاں فلاں آدمیوں نے شہادت دی ہے کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے اور انہوں نے ہمیں گواہ بنا کر بھیجا ہے کہ ہم آپ تک ان کی گواہی پہنچا دیں۔ یہ شہادت علی الشہادت کی صورت ہے۔ اور یہ ثبوت ہلال رمضان وعید دونوں کے لیے معتبر ہے۔ اور اگرچہ شاہدان اصل کے لیے دو گواہوں کا الگ الگ ہونا (یعنی چار ہونا) شرط نہیں بلکہ وہ دو گواہ دونوں کے گواہ بن سکتے ہیں مگر بہتر یہ ہے کہ ہر گواہ اپنی طرف سے دو گواہ الگ الگ بنا لے، یعنی اصل گواہ دو ہیں تو ان کے قائم مقام چار ہوں۔

(۴) شہادت علیٰ قضاء القاضی: قاضی یا مفتی کی مجلس میں شرعی شہادت پیش ہو اور مجلس میں دو دیندار پابندِ شرع مسلمان شروع سے آخر تک حاضر ہوں اور پھر وہ کسی دوسرے مقام کے قاضی یا مفتی کے سامنے حاضر ہو کر شہادت دیں کہ فلاں مقام پر قاضی یا مفتی کی مجلس میں ہمارے سامنے رؤیت ہلال کی شہادتیں پیش ہوئیں اور ان شہادتوں کی سماعت کے بعد قاضی یا مفتی نے رؤیت ہلال کا فیصلہ کر دیا تو یہ بھی ثبوت ہلالِ رمضان وعید کے لیے معتبر ہے اور ان کی شہادت پر رؤیت ہلال کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

(۵) کتاب القاضی اِلی القاضی: ایک جگہ کے قاضی یا مفتی کے سامنے شرعی شہادت پیش ہوئی اور اس نے رؤیت ہلال کا فیصلہ کر دیا' اب وہ دوسرے مقام کے قاضی یا مفتی کے نام دو دیندار مسلمانوں کے سامنے خط لکھے کہ میرے سامنے شرعی شہادت پیش ہوئی جس کی بنا پر میں نے رویت ہلال کا فیصلہ کر دیا۔ وہ اس پر اپنے دستخط ومہر لگائے اور ان کو سنا کر بند کر کے ان کے حوالے کر دے۔ وہ دونوں شخص وہ خط لے کر دوسرے مقام کے قاضی یا مفتی کے پاس جا کر گواہی دیں کہ یہ فلاں قاضی یا مفتی کا مکتوب ہے' اس نے ہمارے سامنے لکھا' پڑھا اور ہمارے حوالے کیا کہ ہم آپ تک یہ مکتوب پہنچا دیں' تو دوسری جگہ کا قاضی یا مفتی اس کو منظور کر کے اعلان کرا سکتا ہے۔ یہ بھی ثبوتِ ہلال کے لیے حجت ہے۔

(۶) خبر مستفیض: یہ بھی ثبوت ہلال کے لیے حجت ہے۔ استفاضہ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں چاند ہوا ہے وہاں سے متعدد جماعتیں اگر یہ خبر دیں کہ اس شہر کے مسلمانوں نے چاند دیکھ کر روزہ رکھا ہے۔ محض خبر کا پھیل جانا کہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کون اس کا راوی ہے اور کس نے یہ بات چلائی ہے خبر مستفیض نہیں۔

ریڈیو' ٹیلی ویژن کی خبر ایک اعلان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اعلان اگر رؤیت ہلال کی باضابطہ کمیٹی کی جانب سے ہو جو چاند ہونے کی باقاعدہ شہادت لے کر چاند ہونے کا فیصلہ کرتی ہے یا کسی ایسے شخص کی جانب سے ہو جس کو وہاں کے مسلمانوں نے قاضی یا امیر شریعت کی حیثیت سے مان رکھا ہے اور وہ باضابطہ شہادت لے کر فیصلہ کیا کرتا ہے اور اعلان کرنے والا خود قاضی یا امیر شریعت یا کمیٹی کا معتمد نمائندہ ہو تو مقامی کمیٹی اس پر اعتماد کر کے رویت ہلال کا فیصلہ کر دے۔

❁❁❁

بقیہ: حکمتِ نبویؐ

آسمان سے بارش تو یکساں ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنا برتن سیدھا رکھا ہوتا ہے اُس کو پانی مل جاتا ہے مگر اُسی بارش میں جس شخص نے اپنا برتن الٹا رکھے رکھا وہ بارش کا ایک قطرہ بھی حاصل نہ کر سکے گا۔ اب اگر یہ نادان شکایت کرے کہ اتنی بارش ہوئی مگر مجھے تو ایک قطرہ پانی بھی نہیں ملا تو اس کی یہ شکایت انتہائی لغو ہوگی۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اپنے عقیدے اور عمل کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ ساری عمر خواہش نفس کے پیچھے لگا رہا۔ شرکیہ امور انجام دیتا رہا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت سے محروم رہا۔ اللہ کی رحمت تو انسان کو پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارا پروردگار روزانہ رات کے آخری تہائی حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اس کے سوال کو پورا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے اور میں اس کو بخش دوں؟'' (بخاری ومسلم)

اہل السنّت والجماعۃ کون؟[۳]

حافظ نذیر احمد ہاشمی

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مابین اختلافی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ''ایمان میں کمی بیشی'' کا ہے۔

ایمان کے لغوی معنی

ایمان کا لفظ ء م ن سے مشتق ہے اور امن خوف کی ضد ہے یعنی اطمینان اور طمانیت۔ ''والامن نقیض الخوف'' [۶۵] جب یہ باب افعال سے آتا ہے تو متعدی ہو جاتا ہے اور اس کے معنی ازالہ خوف کے ہو جاتے ہیں۔ ''فامّا آمنتُہٗ فھو ضد اخفتہٗ''[۶۶]۔ پھر کبھی وہ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے آمنتہٗ میں نے اس سے خوف زائل کر کے اس کو مطمئن کر دیا''۔ اور کبھی متعدی بہ دو مفعول ہوتا ہے مثلاً آمنتہٗ غیری ''میں نے اس کو اپنے غیر سے بے خوف اور مطمئن کر دیا''۔ پھر جب یہ بابِ افعال سے استعمال ہوتا ہے تو اس کا معنی ازالہ خوف ہوتا ہے اور متعدی بہ دو مفعول ہوتا ہے۔ اس صورت میں پہلے مفعول کی طرف بنفسہ اور دوسرے مفعول کی طرف بواسطہ حرفِ جر ''مِن'' متعدی ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ ایلاف کی آیت کریمہ ہے ﴿وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾ دوسرا مفعول ''خوف'' بواسطہ ''مِن'' مذکور ہے۔

کبھی لفظ ''ایمان'' ''باء'' کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کے معنی تصدیق کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ صاحب لسان العرب رقم طراز ہیں:

آمن بہ ' ای صدق ..... والایمان : التصدیق[۶۷]

اور ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾(الحجرات:۱۵)

پھر وہ ''باء'' کبھی تو ذوات پر داخل ہوتی ہے مثلاً آمَنْتُ بِاللّٰہِ اور کبھی احکام پر۔ مثلاً:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۸۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ''ایمان'' بمعنی ازالہ خوف ہوتا ہے جب وہ متعدی بنفسہٖ ہو اور بمعنی تصدیق ہوتا ہے جب وہ متعدی بالباء ہو۔

زمخشری نے لکھا ہے کہ ایمان بمعنی تصدیق متعدی بالباء کی صورت میں اس لیے آتا ہے کہ اس وقت وہ متضمن معنی اعتراف واقرار ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

واما تعديته بالباء فلتضمينه معنى اَقَرَّ و اعترف(٦٨)

''ایمان'' کو باء کے ذریعے متعدی اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ متضمن معنی اقرار واعتراف ہوتا ہے (اوراقرارواعتراف کا صلہ باء آتا ہے)۔''

یہ دونوں معنی ازالۂ خوف اور تصدیق ایمان کے حقیقی معنی ہیں' لفظ ایمان ان دونوں میں مشترک ہے۔ جب متعدی بنفسہٖ ہوتو پہلے معنی اور متعدی بالباء کی صورت میں دوسرے معنی (تصدیق) مراد لیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کے برعکس یہ قول بھی ملتا ہے کہ ایمان کے حقیقی معنی ازالہ خوف ہی کے ہیں' لیکن تصدیق میں تکذیب سے امن دینا اور خوف کو زائل کرنا ہوتا ہے۔ اس تعلق سے ایمان کے معنی مجازاً تصدیق کے بھی ہوتے ہیں' جیسا کہ صاحبِ کشاف نے لکھا ہے:

الايمان افعال من الأمن ثم يقال آمنه اذا صدقه وحقيقته آمنه من التكذيب والمخالفة(٦٩)

''ایمان امن سے باب افعال کا مصدر ہے۔ ''آمنہ'' کا معنی ''صدقہ'' ہے۔ اس نے اس کی تصدیق کی اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ تکذیب اور مخالفت سے اس کو مامون کر دیا۔

اس کا ایک تیسرا استعمال بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے صلہ میں لام لایا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَنُـؤْمِنُ لَکَ وَاتَّـبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ (الشعراء)

''کیا ہم تمہاری بات مانیں گے جبکہ آپ کے پیروکار ذلیل ترین لوگ ہیں۔''

﴿وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّـنَا وَلَـوْ کُنَّا صٰدِقِیْنَ﴾ (یوسف)

''اور آپ ہماری بات ماننے والے نہیں اگرچہ ہم سچے ہوں۔''

﴿اَنُـؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''کیا ہم دو ایسے آدمیوں کی بات ماننے والے بن جائیں جو ہماری طرح ہیں اور ان کی قوم ہماری غلام ہے۔''

اس استعمال کے بارے میں علامہ آلوسی نے لکھا ہے:

ويتعدى باللام كما فى قوله تعالى.....﴿اَنُـؤْمِنُ لَکَ وَاتَّـبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾..... باعتبار تضمينه معنى الاذعان (٧٠)

''ایمان کا صلہ جب لام آتا ہے یا بالفاظِ دیگر جب ایمان متعدی باللام ہوتا ہے جیسا کہ آیتِ کریمہ ﴿اَنُـؤْمِنُ لَکَ وَاتَّـبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ ہے تو اس وقت معنی انقیاد (فرمانبرداری) کو متضمن ہوتا ہے۔''

حاصل یہ کہ ایمان کا استعمال تین طریقے سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ متعدی بنفسہ ہوتا ہے خواہ ایک

مفعول کی طرف ہو یا دو کی طرف ۔ پھر دوسرا مفعول چاہے بلا واسطہ حرف جر ہو یا بواسطہ حرف جر ہو' اس صورت میں اس کا معنی ازالہ خوف ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایمان بمعنی ''تصدیق'' ہو اور ''باء'' کے صلہ کے ساتھ آئے۔

تیسری صورت یہ کہ ایمان بمعنی انقیاد ہو اور لام کے صلہ کے ساتھ آئے۔ ایمان کا لفظ جب متعدی بالباء ہوتا ہے (جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ہے) تو اس کا معنی تصدیق ہوتا ہے' اور اس تصدیق کا مفہوم بقول جرجانی اور محمد اعلاء تھانوی درج ذیل ہے:

''تصدیق فعل قلبی کا نام ہے جو قلبی قوتِ ایمانی سے سرزد ہوتا ہے' اور یہ اختیاری فعل ہے جس کا کرنا یا نہ کرنا فاعل کے بس میں ہوتا ہے''۔(۷۱)

مختصر یہ کہ کسی خبر یا خبر دینے والے کو اپنے اختیار سے صادق قرار دینا تصدیق لغوی ہے۔ جبکہ تصدیق منطقی کا معنی **علم ادراک الماهية مع الحكم عليها بالنفي والاثبات**(۷۲) ہے۔ (ماہیت کے ادراک کا علم اور اس پر نفی یا اثبات کا حکم لگانا) بالفاظ دیگر تصدیق منطقی کا معنی نسبتِ تامہ کا علم اور ادراک ہے۔ اور اس نسبتِ تامہ کا علم کبھی بغیر اختیار کے بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمام تر بدیہیات میں نسبتِ تامہ کے علم و ادراک میں اختیار کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ نیز تصدیق منطقی تکذیب و انکار کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے' تصدیق لغوی نہیں۔

لیکن علامہ آلوسی نے تصدیق لغوی اور منطقی کے درمیان فرق کا انکار کرتے ہوئے دونوں کو ایک ہی گردانا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

وان التصديق المنطقى بعينه التصديق اللغوى ولذا فسره رئيسهم فى الكتب الفارسية (بگرويدن) وفى العربية بما يخالف التكذيب والانكار وهذا بعينه المعنى اللغوى ويؤيد ما اورده السيد السند فى حاشية شرح التلخيص ان المنطقى انما يبين ما هو فى العرف واللغة(۷۳)

''تصدیق منطقی بعینہٖ تصدیق لغوی ہے' اسی لیے رئیس المناطقہ نے فارسی زبان میں لکھی ہوئی اپنی کتابوں میں اس کا معنی گرویدن کیا ہے اور عربی میں لکھی ہوئی اپنی کتابوں میں تصدیق کا معنی **ما يخالف التكذيب والانكار** کیا ہے اور بعینہٖ یہی مفہوم تصدیق لغوی کا ہے۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو سید السند نے **شرح التلخيص** کے حاشیے میں لکھا ہے کہ منطقی عرف ولغت ہی کو بیان کرتا ہے۔''

ایمان کا شرعی معنی

علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے:

اما فی الشرع فھو التصدیق بما علم مجیٔ النبی ﷺ ضرورۃ تفصیلاً فیما علم تفصیلا و اجمالاً فیما علم اجمالاً وھذا مذھب جمھور المحققین[٧٤]

''جمہور محققین کے نزدیک ایمان کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جن چیزوں کا ثبوت قطعی طور پر ہوا ہے اس کی تصدیق کرنا ایمان کہلاتا ہے۔ پھر جن چیزوں کا ثبوت تفصیلی ہے تو اس کی تصدیق تفصیلی طور پر اور جن کا ثبوت اجمالی ہے تو تصدیق بھی اجمالی طور پر کرنا ضروری ہے۔''

مذکورہ بالا تعریف میں ''ضرورۃً'' سے مراد یقیناً ہے۔ یعنی جو چیز قطعی طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو اس کی تصدیق کو ایمان اور اس کے انکار کو کفر قرار دیا جائے گا۔[٧٥]

امام رازی نے ایمان اور کفر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

ان کل ما ینقل عن محمد ﷺ انه ذھب الیه وقام به فاما ان یعرف صحة ذٰلک النقل بالضرورة او بالاستدلال او بخبر الواحد. اما القسم الاول: وھو الذی عرف بالضرورة مجیٔ الرسول علیه السلام به فمن صدقه فی کل ذٰلک فھو مؤمن، ومن لم یصدقه فی ذالک، فاما بان لا یصدقه فی جمیعھا او بأن لا یصدقه فی البعض فذٰلک ھو الکافر، فَاِذَنُ الکفر عدم تصدیق الرسول فی شیء مما علم بالضرورۃمجیئه بهٖ ومثاله من انکر وجود الصانع او کونه عالمًا قادرًا مختارًا أو کونه واحدًا.....[٧٦]

''رسول اللہ ﷺ سے دین کے سلسلے میں جو کچھ ہم تک منقول ہوا ہے اس نقل کی صحت کا علم یا تو یقینی ہوگا یا استدلال کے ذریعے ہوگا یا خبر واحد کے ذریعے ہوگا۔ پہلی قسم (جن کا علم قطعی اور یقینی ہے) ان تمام کی تصدیق کرنے والا مؤمن ہے۔ بصورتِ دیگر اگر کوئی تمام یقینیات کی تصدیق نہیں کرتا یا ان میں سے بعض کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ کافر ہے۔ لہٰذا کفر کی تعریف یہ ہے کہ جو چیزیں آپ ﷺ سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہیں ان میں کسی ایک کی تصدیق نہ کرنا کفر کہلاتا ہے، مثلاً کوئی وجود صانع کا انکار کردے یا اس کے عالم، قادر، مختار اور واحد ہونے کا انکار کردے......وغیرہ''

امام غزالی نے ایمان اور کفر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

الایمان تصدیق النبی ﷺ بجمیع ما جاء به

یعنی ''ایمان کے لیے تمام ان چیزوں کی تصدیق ضروری ہے جو رسول اللہ ﷺ سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں۔''

اور کفر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

والکفر تکذیب النبی ﷺ فی شیءٍ مما جاء به

یعنی ''رسول اللہ ﷺ سے قطعی طور پر ثابت شدہ اشیاء میں سے کسی ایک کا انکار کرنا کفر کہلاتا ہے۔''

امام غزالی کی مذکورہ تعریفات سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کے لیے **جمیع ما جاء به الرسول**

ﷺ کی تصدیق لازمی ہے اور کفر کے لیے **جمیع ما جاء به النبی** ﷺ میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ باقی رہا یہ کہ اگر کوئی آدمی نہ **تصدیق جمیع ما جاء به النبی** ﷺ اور نہ **تکذیب شیءٍ مِمَّا جاء به النبی** ﷺ کرتا ہے بلکہ **لا اصدق ولا اکذب** کہے تو اس کی حیثیت کیا ہوگی۔ کیونکہ امام غزالی کی مذکورہ بالا ایمان و کفر کی تعریف سے ایسے آدمی کا حکم معلوم نہیں ہوتا جبکہ بالاتفاق ایسا شخص کافر ہے۔ اس اعتراض سے بچنے کی خاطر امام رازی نے کفر کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ سے کی ہے:

الکفر عدم تصدیق الرسول صلی الله علیه وسلم فی شیءٍ مما علم بالضرورة مجیئه به ومثاله من انکر وجود الصانع أو کونه عالمًا قادرًا مختارًا أو کونه واحدًا أو کونه منزها عن النقائص والآفات.....(۷۷)

''کفر کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیزیں رسول اللہ ﷺ سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہیں ان میں سے کسی ایک کی تصدیق نہ کرنا' مثلاً کوئی وجودِ صانع کا انکار کردے یا اس کے عالم' قادر' مختار ہونے کا یا اس کی وحدانیت کا یا نقائص و آفات سے اس کے منزہ ہونے کا۔''

پھر رسالت مآب ﷺ سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت شدہ امور کی تصدیق میں بھی یہ شرط ہے کہ اس کی بنیاد آپ ﷺ پر اعتماد ہو نہ کہ عقل کی کسوٹی۔ چنانچہ متذکرہ بالا امور کی تصدیق کی بنیاد اگر عقل ہو تو وہ تصدیق ایمان نہیں' جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿**فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا**﴾ (النساء)

''پس (اے پیغمبر) تمہارے رب کی قسم' یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی جھگڑوں میں یہ تمہیں حَکم نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اُس سے اپنے دلوں میں ذرا بھی تنگی نہ پائیں اور (دل و جان سے اُس کو) تسلیم نہ کرلیں۔''

بالفاظِ دیگر ایمان کی تعریف میں مذکورہ لفظ ''تصدیق'' سے مراد تصدیق اختیاری ہے نہ کہ وہ تصدیق جس کی بنیاد عقل کی کسوٹی ہو۔ لیکن اگر تصدیق اختیاری ہی کا نام ایمان ہے تو پھر ابوطالب اور ہرقل کو بھی مؤمن ماننا پڑے گا' کیونکہ ابوطالب کے متعدد اشعار جو ابن ہشام نے سیرتِ ابن ہشام میں اور حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں نقل کیے ہیں' اسی طرح ہرقل کے الفاظ جو امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں نقل کیے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو تصدیق اختیاری حاصل تھی۔ چنانچہ ابن اسحاق نے ابوطالب کے طویل قصیدہ لامیہ کے درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

۱) **کذبتم وبیت الله نبذی محمدًا ولما نطاعن دونه ونناضل**

''کعبہ کی قسم' تم دروغ گو ہو کہ محمد ہم سے چھین لیے جائیں گے اور ہم نے ابھی تک ان کی حفاظت

کے لیے نہ برچھے چلائے نہ تیر مارے۔''

۲) **ونسلمه حتی نصرع حوله ونذهل عن ابنائنا والحلائل**

''اور ان کو ہم تمہارے سپرد نہ کریں گے تاوقتیکہ ہم ان کے گرد وپیش کٹ جائیں اور اپنے اہل و عیال سے بے نیاز ہو جائیں۔''

۳) **وأبیض یستسقی الغمام بوجهه ثمال الیتامی عصمة للأرامل**

''اور وہ سفید فام ہے' اس کے رُخِ انور کی بدولت ابر رحمت طلب کیا جاتا ہے' یتیموں کا فریادرس اور بیواؤں کا سہارا اور سرپرست ہے۔''

۴) **یلوذ به الهلاف من آل هاشم فهم عنده فی رحمة وفواضل**

''آل ہاشم کے خستہ حال لوگ اس کی آڑ اور پناہ لیتے ہیں' وہ اس کے ہاں رحمت ونوازش اور فضل و کرم میں ہیں۔''

۵) **فمن مثله فی الناس ای مؤمل اذا قاسه الحکام عند التفاضل**

''لوگوں میں آنحضورﷺ کے مثل کون ہے؟ جب حکام ایک دوسرے کی برتری ثابت کرنے کے وقت موازنہ کریں تو کس کی امید کی جاسکتی ہے۔''

۶) **حلیم رشید عادل غیر طائش یوالی اِلٰها لیس عنه بغافل**

''بردبار' اعلیٰ مدبر' منصف مزاج' دانا وبینا' اللہ سے محبت رکھتا ہے' وہ اس سے غافل نہیں۔''

۷) **کریم المساعی ماجد وابن ماجد له ارث مجد ثابت غیر فاصل**

''اعلیٰ سعی وکاوش اور شریف وشریف کی اولاد ان کی بزرگی کی وراثت بغیر نزاع کے ثابت ہے۔''

۸) **وایّده رب العباد بنصره واظهر دینا حقه غیر زائل**

''پروردگارِ عالم نے ان کی تائید اپنی مدد سے کی ہے اور اس نے ایسے دین کا اعلان کیا ہے جس کی حقانیت لازوال ہے۔''

۹) **لقد علموا ان ابننا لا مکذب لدینا ولا یعنی بقول الأباطل**

''سب جانتے ہیں کہ ہمارا فرزند ارجمند ہمارے نزدیک جھوٹا نہیں اور نہ ہی باطل گفتگو اس کا مقصد ہے۔''

۱۰) **فاصبح فینا احمد فی أرومة تقصر عنه سورة المتطاول**

''ہمارے خاندان میں احمد ایسے مقام پر فائز ہیں کہ دست درازی کرنے والے کے حملہ سے وہ محفوظ ہیں۔''

۱۱) **حدبْتُ بنفسی دونه وحمیته ودافعت عنه بالذرا والکلاکل**

''میں نے ان کے ورے اپنی جان قربان کر دی ہے اور ان کی حمایت کر کے ان کا دفاع ہر ممکن

طریقے سے کیا ہے۔''(۷۸)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب ''الاصابه فی تمییز الصحابة ''میں ابوطالب کے درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

ودعوتَنی وعلمتُ انک صادق　　ولقد صدقتَ فکنتَ قبل امینا

ولقد علمتُ بانّ دین محمد　　من خیر ادیان البریة دینا (۷۹)

''آپ نے مجھے (توحید کی) دعوت دی ہے اور مجھے آپ کے سچا ہونے کا یقین ہے' اور آپ نے سچ کہا ہے اس سے پہلے بھی آپ امین تھے' اور مجھے یقین ہے کہ محمد کا دین تمام ادیان سے بہترین ہے۔''

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں سورۃ الانعام آیت ۲۶ ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے ابوطالب کے درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

۱) والله لن یصلوا الیک بجمعهم　　حتی اُوَسَّدَ فی التراب دفینا

''بخدا وہ لوگ (میری زندگی میں) گروپ بندی کے باوجود آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے یہاں تک کہ میں زمین میں دفن ہو جاؤں۔''

۲) فاصدع بامرک ما علیک غضاضة　　وابشر بذاک وقر منک عیونا

''اپنا کام جاری رکھیے آپ پر کوئی ملامت نہیں' بلا کم و کاست خوش رہو اور اس کے باعث آپ کی آنکھیں خنک اور ٹھنڈی ہوں۔''

۳) دعوتَنی وزعمتُ انک ناصحی　　فلقد صدقتَ وکنتَ قبل امینا

''آپ نے مجھے (توحید کی) دعوت دی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں' آپ نے واقعی سچ کہا ہے اور آپ پہلے سے امین ہیں۔''

۴) وعرضتَ دینا قد عرفتُ بانه　　من خیر ادیان البریة دینا (۸۰)

''اور آپ نے دین اسلام پیش کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کائنات کے تمام ادیان سے بہترین دین ہے۔''

حافظ ابن حجر نے بھی مذکورہ بالا اشعار میں سے صرف پہلا شعر نقل کیا ہے۔(۸۱)

اسی طرح ہرقل نے ابوسفیان سے سوال و جواب کے ذریعے تصدیق حاصل کر لی تھی جس کی بنیاد پر اس کو تصدیق اختیاری حاصل ہو گئی تھی' جیسا کہ اس کے اقوال ''فکذٰلک الرسل تبعث فی نسب قومها'' اور ''لو کان احد قال هذا القول قبله لقلت: رجل یتأسی بقولٍ قیل قبلهٗ' اور ''فلو کان من آبائه من ملک قلت : رجل یطلب ملک أبیه' اور ''فقد اعرف انه لم یکن لیذر الکذب علی الناس ویکذب علی الله'' اور'' ان ضعفاء هم اتبعوه وهم اتباع الرسل'' اور'' وکذٰلک الایمان حین تخالط بشاشة القلوب'' اور'' فان کان حقا ما یقول فسیملک موضع قدمی هاتین' اور

''فلو انی اعلم انی اخلص الیه لتجشمت لقاء ہ''اور'' ولو کنتُ عندہ لغسلتُ عن قدمیه'' اور'' وقد کنتُ أعلم انه خارج لم أکن أظن انه منکم''اور'' یامعشر الروم هل لکم فی الفلاح والرشد وان یثبت ملککم فتبایعوا هذا النبی''(۸۲)

ابوطالب کے مذکورہ بالا اشعار اور ابوسفیان کے ساتھ ہرقل کی مندرجہ بالا گفتگو سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو تصدیق اختیاری حاصل تھی جو ایمان کے لیے ضروری ہے' لیکن بایں ہمہ ان دونوں کو مؤمن تسلیم نہیں کیا گیا؟ کیوں' اس لیے کہ بقول ابن الہمام ایمان کے لیے تصدیق قلبی اختیاری کے ساتھ استسلام باطنی اور انقیاد قلبی بھی ضروری ہے اور وہ ان دونوں کو حاصل نہیں تھا' جبکہ بقول ابن تیمیہؒ تصدیق کے ساتھ التزامِ طاعت ضروری ہے اور ان دونوں نے تصدیق کے ساتھ طاعت کا التزام نہیں کیا تھا۔ التزامِ طاعت وشریعت' استسلام باطنی اور انقیاد قلبی کی عدم موجودگی کی بنا پر ان دونوں کو مؤمن نہیں کہا گیا۔(۸۳)

ہرقل کے بارے میں تو مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں اس کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب اس نے اپنے اہل دربار کی اسلام سے نفرت دیکھی تو کہا:

انی قلتُ مقالة آنفاً اختبر بها شِدَّتکم علی ایمانکم فقد رأیتُ

''یعنی میں نے یہ باتیں اس لیے کہیں کہ میں دین (نصرانیت) میں تمہاری شدت کا امتحان لینا چاہتا تھا اور وہ میں نے لے لیا۔''

ہرقل کے مندرجہ بالا قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ التزامِ طاعت کے لیے تیار نہیں تھا۔

علامہ نوویؒ نے صحیح مسلم کی حدیث میں ہرقل کے الفاظ''ولو اعلم انی اخلص الیه'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

هکذا فی صحیح مسلم ووقع فی البخاری لتجشمت لقاء ہ ..... ومعناه لتکلفت الوصول الیه وارتکبت المشقة فی ذٰلک ولکن أخاف ان اقتطع دونه' ولا عذر له فی هذا لانه قد عرف صدق النبی ﷺ وانما شح فی الملک ورغب فی الریاسة فـآثرها علی الاسلام(۸۴)

''صحیح مسلم میں ہرقل کے الفاظ''ولو اعلم انی اخلص الیه'' کی جگہ صحیح بخاری میں اس کے الفاظ ''لتجشمت لقاء ہ .....''منقول ہیں جن کا معنی ہے میں ان تک پہنچنے کے لیے کلفت ومشقت برداشت کرتا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ان تک پہنچنے سے پہلے ہی مار دیا جاؤں گا۔ (بقول امام نووی) اس کا یہ عذر تسلیم نہیں کیونکہ اس کو رسول اللہ ﷺ کی صداقت معلوم ہوگئی تھی لیکن اپنی حکومت و ریاست کی حرص اور رغبت کی بنا پر اس نے ایمان پر حکومت وریاست کو ترجیح دی''۔ (اس لیے اس کو مؤمن نہیں کہا جاسکتا)

اس کی تائید مسند بزار کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اس کے یہ الفاظ منقول ہیں:

ابلغ صاحبک انی اعلم انه نبی ولکن لا اترک ملکی[85]

''اپنے دوست کو یہ پیغام پہنچا دو کہ مجھے ان کے نبی ہونے کا یقین ہے لیکن میں اپنی بادشاہت نہیں چھوڑ سکتا۔''

اور ابوطالب نے بھی نار کو عار پر ترجیح دیتے ہوئے کہا تھا:

لو لا الملامة او حذاری سبّة   لوجد تنی سمحاً بذاک مبینًا [86]

''اگر مجھے ملامت کا خوف یا گالی کا ڈر نہ ہوتا تو آپ مجھے اس دین کو بڑی فراخدلی کے ساتھ قبول کرنے والا پاتے''۔

اور ابن اسحاق نے ابوطالب کے طویل قصیدہ لامیہ میں ان کے درج ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

فو الله لو لا ان اجئ بسبّة   تجرّ علی أَشْیاخنا فی المحافل

لکنا تبعناه علٰی کل ضالة   من الدهر جدًّا غیر قول التهاذل [87]

''واللہ! اگر مجھے عار و عیب کا اندیشہ نہ ہوتا جس کا مجالس میں ہمارے مشائخ کو طعنہ دیا جاتا ہے تو ہم ہر حالت میں، مذاق اور مزاح کے علاوہ، سنجیدگی سے ان کی پیروی کرتے۔''

اور صحیح مسلم میں ابوطالب کا یہ قول بھی منقول ہے:

لو لا ان تعیرنی قریش، یقولون: انما حمله علی ذٰلک الجزع، لَا َقررتُ بهٖ عینک[88]

''اگر مجھے قریش کے اس عار دلانے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ ''اُس نے موت کے ڈر سے یہ کہا ہے''، تو یہ کلمہ کہہ کر میں آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈی کر دیتا (لیکن میں یہ طعنہ برداشت نہیں کر سکتا اس لیے ایمان قبول نہیں کر سکتا)''۔

ابوطالب کے مندرجہ بالا اشعار سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کو اگرچہ تصدیق حاصل تھی لیکن اس میں استسلامِ باطنی اور انقیادِ قلبی موجود نہیں تھا، لہٰذا مؤمن ہونے کا اطلاق اس پر نہیں کیا جا سکتا۔ حاصل یہ کہ تصدیق کے ساتھ ساتھ استسلامِ باطنی اور انقیادِ قلبی جس میں موجود ہو وہ مؤمن ہے چاہے خوف کی وجہ سے وہ اپنے ایمان کو چھپائے، تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ جیسا کہ خود قرآن مجید کا بیان ہے: ﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ﴾ (المؤمن: ٢٨) نیز نجاشی کو بھی تصدیق قلبی اور استسلامِ قلبی کی بنیاد پر ہی مؤمن کہا گیا اگرچہ اس نے ایمان کو چھپائے رکھا۔ اور اس کے مؤمن ہونے کی سب سے بڑی دلیل رسول اللہ ﷺ کا ان کی نماز جنازہ پڑھنا ہے۔

التزامِ طاعت اور استسلام وانقیاد باطنی
رکن ایمان ہے یا شرطِ ایمان ہے؟

دونوں قول موجود ہیں۔ رکن ماننے کی صورت میں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ابتداءً تحققِ ایمان کے لیے تو یہ التزام ضروری ہے' اس کے بغیر تحققِ ایمان نہیں ہوگا' بعد میں اگر کوئی معصیت صادر ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے سلبِ ایمان نہیں ہوگا۔ اس کی مثال مجرم کی ہے کہ اس جرم پر وہ سزا کا مستحق بھی ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا جرم معاف کر دیا جائے۔ اور تصدیق کے ساتھ التزامِ طاعت نہ کرنے والے کی مثال باغی کی ہے کہ وہ امام وقت کی حکومت کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا' لہٰذا اس کا ایمان ہی متحقق نہ ہوگا۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے فضل الباری شرح صحیح بخاری جلد اول کا مطالعہ نہایت ہی مفید رہے گا۔

حقیقتِ ایمان کے بارے میں مذاہب

حقیقتِ ایمان کے بارے میں جس طرح اہل حق میں اختلاف ہے اسی طرح فرقِ باطلہ اور ضالہ میں بھی اختلاف ہے' جیسا کہ ذیل میں ذکر کیا جا رہا ہے:

جہمیہ اور ایمان

یہ فرقہ جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔ اس فرقے کے نزدیک ایمان صرف معرفت قلبی کا نام ہے خواہ وہ معرفت اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔ امام رازی نے ایمان کے بارے میں مختلف فرقوں کے مسالک بیان کرتے ہوئے اس فرقے کے ایمان کے بارے میں خیالات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

الفرقة الثالثة : قالوا : الایمان عبارة عن عمل القلب فقط وهؤلاء قد اختلفوا علی قولین احدهما: ان الایمان عبارة عن معرفة الله بالقلب حتی ان من عرف الله بقلبه ثم جحد بلسانه ومات قبل ان یقربه فهو مؤمن کامل الایمان وهو قول جهم بن صفوان. اما معرفة الکتب والرسل والیوم الآخر فقد زعم انها غیر داخلة فی حد الایمان وحکی الکعبی عنه ان الایمان معرفة الله مع معرفة کل ما علم بالضرورة کونه من دین محمد ﷺ. ثانیهما: ان الایمان مجرد التصدیق بالقلب وهو قول الحسین بن الفضل البجلی(۸۹)

''ایمان کی تعریف کے بارے میں تیسرے فرقے کا کہنا ہے کہ ایمان صرف دل کا معاملہ ہے۔ اس فرقے کا پھر آپس میں اختلاف ہے۔ ایک قول تو جہم بن صفوان کا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اللہ عز وجل کی معرفت قلبی کا نام ہے' اگر کسی کو اللہ کی معرفت قلبی حاصل ہے اور زبان سے انکار کرے اور اقرار

سے پہلے مر جائے تو وہ مؤمن کامل ہوگا۔ اللہ کے علاوہ کتب سماویہ، سابقہ انبیاء و رسل اور روزِ آخرت کی معرفت جہم بن صفوان کے نزدیک ایمان کی حد میں داخل نہیں۔ لیکن کعبی نے اس سے نقل کیا ہے کہ ایمان کی تعریف میں اللہ کی معرفت کے ساتھ ساتھ تمام ان اشیاء کی معرفت بھی شامل ہے جن کا دین محمدی میں شامل ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ دوسرے فرقے کا کہنا ہے کہ ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے اور یہ حسین بن الفضل البجلی کا قول ہے۔''

خلاصہ یہ کہ جہم بن صفوان کے نزدیک ایمان کے لیے تصدیق، انقیاد قلبی اور التزامِ شریعت ضروری نہیں۔ اس قول کی رو سے ابوطالب اور ہرقل کو بھی مؤمن ماننا پڑے گا، کیونکہ ان کو نہ صرف معرفت بلکہ معرفت اختیاری حاصل تھی۔ بلکہ اہل کتاب کو بھی مؤمن ماننا پڑے گا کیونکہ ان کے بارے میں خود قرآن مجید کا بیان ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرہ:۱٤٦، الانعام:۲۰)

اس کے اس عقیدے کا ثبوت اس مناظرے سے بھی ہوتا ہے جو اس نے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے کیا تھا جو ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب ''حیات ابی حنیفہ'' میں علامہ مکی کی المناقب سے نقل کیا ہے۔ اس وقت نہ میرے سامنے المناقب ہے اور نہ ابوزہرہ کی اصل کتاب۔ بلکہ اس کا اردو ترجمہ ہے جو غلام احمد حریری نے کیا ہے۔ اس کا اقتباس پیش خدمت ہے:

ایک مرتبہ جہم بن صفوان گفتگو کے لیے امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا.....

میں آپ سے صرف ایمان کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا کیا تم ابھی تک حقیقت حال سے آشنا نہیں ہو کہ سوال کی ضرورت پڑی؟ جہم نے کہا کیوں نہیں، البتہ ایمان کی ایک نوع میں مجھے شبہ ہو گیا وہ دور کرنا چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا ایمان میں شک کرنا کفر ہے۔ جہم نے کہا آپ کے لیے بالکل جائز نہیں کہ میرے کفر کی وجہ نہ بتائیں۔ امام صاحب نے فرمایا پھر بولو کیا پوچھتے ہو؟

جہم: یہ بتائیے ایک شخص دل سے خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے وہ اس کو واحد یگانہ اور لامثیل ونظیر سمجھتا ہے، اس کی صفات سے بھی آشنا ہے، لیس کمثلہ شیء بھی مانتا ہے مگر ان سب باتوں کا زبان سے اقرار کیے بغیر مر جاتا ہے، کیا یہ شخص کفر پر مرا یا اسلام پر؟

امام اعظم صاحب نے فرمایا یہ شخص کافر ہے اور جہنمی، جب تک کہ قلبی معرفت کے ساتھ لسانی اقرار جمع نہ ہو۔

جہم: وہ مؤمن کیسے نہیں جب کہ وہ خدا کی مع صفات معرفت حاصل کر چکا ہے؟

امام صاحب: اگر تم قرآن پر ایمان رکھتے ہو اور اسے حجتِ شرعیہ سمجھتے ہو تو میں قرآن کے دلائل پیش کروں گا اور اگر ایسا نہیں تو میرا اندازِ گفتگو تم سے وہی ہوگا جو مخالفین اسلام سے ہوتا ہے۔

بعد ازاں امام صاحب نے قرآنی دلائل پیش کیے تو جہم نے کہا کہ آپ نے میرے دل کی دنیا ہی بدل دی، میں پھر لوٹ کر حاضر خدمت ہوں گا۔(۹۰)

فرقہ کرامیہ [۹۱]

اس فرقہ کے نزدیک ایمان اقرار باللسان کا نام ہے' تصدیق بالقلب اور عمل بالجوارح کی ضرورت نہیں ہے۔عبدالقاہر بغدادی نے اس فرقہ کے اعتقاد کے بارے میں لکھا ہے:

زعموا ان المقر بالشهادتين مؤمن حقا وان اعتقد الكفر بالرسالة وزعموا ايضاً ان المنافقين الذين انزل الله تعالى فى تكفيرهم آيات كثيرة كانوا مؤمنين حقًا وان ايمانهم كان كايمان الانبياء والملٰئكة[۹۲]

''فرقہ کرامیہ کا خیال ہے کہ شہادتین کا اقرار کرنے والا مؤمن برحق ہے چاہے وہ رسالت کا منکر بھی ہو۔اسی طرح ان کا خیال ہے کہ منافقین (جن کی تکفیر میں آیاتِ کثیرہ اللہ نے نازل کی ہیں) نہ صرف مؤمنین برحق تھے بلکہ ان کا ایمان انبیاء اور ملائکہ کے ایمان کی طرح تھا۔'' (نعوذ باللہ من ذٰلک)

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے:

وذهب الكرامية الى ان الايمان شرعاً اقرار باللسان فقط لاغير[۹۳]

علامہ فخرالدین رازی نے لکھا ہے:

ان الايمان مجرد الاقرار باللسان وهو قول الكرامية[۹۴]

مرجئہ [۹۵]

مرجئہ ارجاء سے مشتق ہے اور ارجاء کا معنی مؤخر کرنا ہے۔اس فرقہ کے نزدیک ایمان کے لیے فقط تصدیق قلبی کافی ہے۔یہی تصدیق نجاتِ اُخروی کے لیے کافی ہے عمل کی ضرورت نہیں۔گویا انہوں نے عمل کو مؤخر کر دیا اس لیے ان کو مرجئہ کہا جاتا ہے۔وہ یہ کہتے ہیں کہ جس طریقے سے بغیر ایمان کے کوئی آدمی جنت میں نہیں جا سکتا' خواہ اس نے کتنے ہی اچھے کام کیے ہوں وہ مخلد فی النار ہوگا' اسی طرح اگر کسی شخص کے قلب میں تصدیق موجود ہے تو اس کے گناہ خواہ کتنے ہی ہوں وہ دوزخ میں ہرگز نہیں جائے گا۔ جیسے ایمان کے بغیر کوئی آدمی ہرگز جنت میں نہیں جا سکتا اسی طرح ایمان (تصدیق قلبی) کے ساتھ گناہوں کی وجہ سے کوئی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ بالفاظِ دیگر وہ ''**الطاعة لا تفيد**'' اور ''**المعصية لا تضر**'' کے قائل ہیں' انہوں نے عمل کو بالکل پیچھے ڈال دیا ہے' نہ اقرار باللسان ان کے ہاں ضروری ہے اور نہ عمل بالارکان۔

معتزلہ وخوارج

معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایمان بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے تصدیق بالقلب' اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے۔اس پر تو ان دونوں فرقوں کا اتفاق ہے' اس کے بعد تفصیلات میں ان کا اختلاف ہے۔

خوارج کے نزدیک ایمان مندرجہ ذیل امور سے مرکب ہے:

(۱) اللہ عزوجل کی معرفت

(۲) ہر اس شے کی معرفت جس پر اللہ عزوجل نے کوئی دلیل عقلی یا کتاب وسنت سے کوئی نقلی دلیل قائم کی ہو۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی تمام مأمورات کی معرفت چاہے فرض ہوں، واجب یا مستحب۔

(۴) تمام منہیات سے اجتناب، چاہے صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔

ان تمام کا مجموعہ ایمان کہلاتا ہے اور مذکورہ بالا امور میں سے کسی ایک کا ترک کفر کہلاتا ہے۔اور معتزلہ کا آپس میں تو اس پر اتفاق ہے کہ جب لفظ ''ایمان'' کو ''باء'' کے ذریعے متعدی کیا جاتا ہے تو اس وقت اس سے مراد اس کا لغوی معنی تصدیق ہوتا ہے، بصورت دیگر اس سے مراد اس کا لغوی معنی (تصدیق) نہیں بلکہ کوئی اور معنی ہوتا ہے اور اس ''اور معنی'' کی تعیین میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ واصل بن عطاء، ابوالہذیل، اور قاضی عبدالجبار کے بقول **ان الایمان عبارة عن فعل کل الطاعات سواء کانت واجبة او مندوبة من باب الاقوال او الافعال او الاعتقادات** (یعنی ایمان تمام تر طاعات کی تعمیل کرنے کا نام ہے چاہے وہ واجب ہوں یا مندوب پھر ان کا تعلق چاہے اقوال سے ہو یا افعال سے یا اعتقادات سے)۔جبکہ ابوعلی جبائی اور ابوہاشم کے نزدیک ایمان نوافل اور مستحبات نہیں بلکہ صرف واجبات کی تعمیل کا نام ہے۔اور نظام کا کہنا ہے کہ ایمان ہر اس کام سے اجتناب کرنے کا نام ہے جس پر کوئی وعید آئی ہو۔ بقول نظام اللہ کے نزدیک مؤمن تو وہ ہے جو تمام کبائر سے اجتناب کرنے والا ہو اور ہمارے (بندوں کے) نزدیک مؤمن وہ ہے جو ہر اس کام سے اجتناب کرنے والا ہو جس پر وعید آئی ہے۔[۹۶]

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا دونوں فرقوں کے نزدیک ایمان مرکب ہے اور تصدیق، اقرار اور عمل تینوں ایمان کے اجزاء ہیں، لہٰذا ان کے نزدیک تارک العمل مخلد فی النار ہوگا۔ پھر خوارج کے نزدیک تو وہ ارتکابِ کبیرہ سے ایمان سے خارج ہو کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے جبکہ معتزلہ کے نزدیک مرتکبِ کبیرہ ایمان سے تو خارج ہو جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ فاسق ہوتا ہے اور یہ فسق ان کے نزدیک ''**منزلة بین المنزلتین**'' ہے۔اور یہ فسق معتزلہ کے نزدیک ایمان اور کفر کے درمیان ایک مرتبہ ہے۔لیکن مرتکب کبیرہ کو چاہے فاسق کہیں یا کافر دونوں فرقوں کے نزدیک وہ مخلد فی النار ہے، لہٰذا انجام اور مآل کے اعتبار سے معتزلہ اور خوارج کے درمیان کوئی فرق نہیں، کیونکہ دونوں مرتکبِ کبیرہ کو مخلد فی النار کہتے ہیں۔

چنانچہ شرح الفقہ الاکبر میں ابومنصور ماتریدی نے امام اعظم ابوحنیفہ کے قول ''**لا نکفر احدًا بذنب ولا ننفی عنه الایمان**'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

هذه مسئلة مختلف فیها، قالت الخوارج اذا ارتکب الانسان کبیرة من الکبائر فانه یکفر ویزول عنه الایمان، وقالت المرجئة لا یضر مع الایمان ذنب کما لا

ینفع مع الکفر طاعة. وقالت القدریة والمعتزلة یخرج بها من الایمان ولا یدخل فی الکفر ویکون بین الکفر والایمان' فاذا تاب الی الله ورجع عنها فانه یدخل فی حیز الایمان قبل الموت' واذا مات قبل ان یتوب منها دخل فی حیز الکفر ویخلد فی النار(۹۷)

''یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔خوارج کا کہنا ہے کہ کبیرہ گناہوں میں سے کسی بھی کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے اور ایمان اس سے زائل ہو جاتا ہے۔مرجئہ کا کہنا ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ مضر نہیں جیسا کہ کفر کے ہوتے ہوئے کوئی اطاعت نافع نہیں' جبکہ معتزلہ کا کہنا ہے کہ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی ایمان سے تو نکل جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا' ایمان اور کفر کے درمیان معلق ہوتا ہے۔اگر مرنے سے پہلے توبہ تائب ہو جائے تو واپس دائرۂ ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔بصورتِ دیگر دائرۂ کفر میں داخل ہو کر مخلد فی النار ہوتا ہے۔''

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کے عقائد وافکار باطلہ کی لمبی چوڑی فہرست دیتے ہوئے لکھا ہے:

حکموا علی العصاة بالنار والخلود فیها ..... وزعموا ان من دخل النار لا یخرج منها(۹۸)

''معتزلہ نے گناہگاروں پر جہنمی اور خلود فی النار کا حکم لگایا ہے.....اور ان کا خیال ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والا کبھی اس سے باہر نہیں نکلے گا۔''

اور اسی کتاب کے ایک دوسرے مقام پر رقم طراز ہیں:

وندین بان لا نکفر احدًا من اهل القبلة بذنب یرتکبه کالزنا والسرقة وشرب الخمور کما دانت بذٰلک الخوارج وزعمت انهم کافرون(۹۹)

''اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم زنا' چوری اور شراب نوشی جیسے کبیرہ گناہوں کے مرتکب اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے' کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں۔''

اور ملا حسین بن اسکندر الحنفی نے امام اعظم کے قول ''**العمل غیر الایمان والایمان غیر العمل**'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

اقول هذا عند اهل الحق نصرهم الله تعالی خلافاً للخوارج' قال ابن حجر الهیثمی فی شرح الاربعین النوویة "الایمان لغة التصدیق وشرط التصدیق بالقلب فقط وقیل یشترط ان یضم الی ذٰلک اقرار باللسان وعمل بسائر الجوارح فیکفر من اخل بواحد من هذه الثلاثة وهو مذهب الخوارج"(۱۰۰)

''میں کہتا ہوں یہ اہل حق کا عقیدہ ہے اللہ ان کی مدد فرمائے۔اس مسئلہ میں خوارج کا اختلاف ہے۔ابن حجر ہیثمی نے اربعین نووی کی شرح میں لکھا ہے کہ ایمان کا لغوی معنی صرف دل سے تصدیق کرنا

ہے' جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ تصدیق قلبی کے ساتھ زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کرنا بھی ایمان کے مفہوم میں شامل ہے' لہٰذا خوارج کے نزدیک ان تین خصائل میں سے کسی ایک کو نقصان پہنچانے والا کافر شمار ہوگا۔''

عبدالقاہر البغدادی نے ان عقائد کی فہرست دی ہے جو خوارج کے تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہا ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ذکر الکعبی فی مقالاته ان الذی یجمع الخوارج علی افتراق مذاهبها اکفار علیّ وعثمان والحکمین واصحاب الجمل وکل من رضی بتحکیم الحکمین والاکفار بارتکاب الذنوب ووجوب الخروج علی الامام الجائر(۱۰۱)

''کعبی نے مقالات میں ذکر کیا ہے کہ خوارج کے تمام تر فرقوں کا (باوجود افتراق مذہب کے) درج ذیل عقائد پر اتفاق ہے: حضرت علیؓ، عثمانؓ، حکمین (عمرو بن العاص اور ابوموسیٰ اشعری) اصحابِ جمل، تحکیم حکمین پر رضامندی کا اظہار کرنے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کی تکفیر اور ظالم امام کے خلاف خروج کے وجوب پر۔''

علامہ تفتازانی نے صاحب **العقائد النسفیه** کے اس قول ''**والکبیرة لا تخرج العبد المؤمن من الایمان ولا تدخله فی الکفر**'' کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

لبقاء التصدیق الذی هو حقیقة الایمان خلافًا للمعتزلة حیث زعموا ان مرتکب الکبیرة لیس بمؤمن ولا کافر وهذا هو المنزلة بین المنزلتین بناءً علی ان الاعمال عندهم جزء من حقیقة الایمان. ولا تدخله ایّ العبد المؤمن فی الکفر خلافًا للخوارج فانهم ذهبوا الی ان مرتکب الکبیرة بل الصغیرة ایضًا کافر وانه لاواسطة بین الایمان والکفر(۱۰۲)

''گناہِ کبیرہ کا ارتکاب بندۂ مؤمن کو ایمان کے دائرے سے نہیں نکالتا' اس لیے کہ تصدیق باقی ہے جو ایمان کی حقیقت ہے۔ معتزلہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے' ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ نہ مؤمن ہے اور نہ کافر' اس کو وہ منزلہ بین المنزلتین کہتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے کی بنیاد اس پر ہے کہ اعمال ان کے نزدیک حقیقتِ
ایمان کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح ارتکابِ کبیرہ سے کوئی مؤمن دائرۂ ایمان سے نہیں نکلتا اسی طرح وہ دائرہ کفر میں بھی داخل نہیں ہوتا' بخلاف خوارج کے' ان کے خیال میں مرتکب کبیرہ بلکہ مرتکب صغیرہ بھی کافر ہے اور ایمان و کفر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے (جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے)۔''

مندرجہ بالا اقتباسات اور حوالجات سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ تمام فرقِ خوارج کے

نزدیک مرتکب کبیرہ کافر ہے۔لیکن عبدالقاہر بغدادی نے اپنی کتاب ''الفرق بین الفرق'' میں لکھا ہے:

وقال شیخنا ابوالحسن الذی یجمعها اکفار علیّ وعثمان واصحاب الجمل والحکمین ومن رضی بالتحکیم وصوّب الحکمین او احدهما ووجوب الخروج علی السلطان الجائر ولم یرض ماحکاه الکعبی من اجماعهم علی تکفیر مرتکبی الذنوب..... الصواب ماحکاه شیخنا ابوالحسن عنهم وقد اخطأ الکعبی فی دعواه اجماع الخوارج علی تکفیر مرتکبی الذنوب. وذٰلک ان النجدات من الخوارج لا یکفرون اصحاب الحدود من موافقتهم وقد قال قوم من الخوارج ان التکفیر بالذنوب التی لیس فیها وعید مخصوص فاما الذی فیه حدٌّ او وعید فی القرآن فلا یزاد صاحبه علی الاسم الذی ورد فیه مثل تسمیته زانیًا وسارقًا ونحو ذٰلک. وقلقالت النجدات ان صاحب الکبیرة من موافقتهم کافر نعمة ولیس فیه کفر دین(۱۰۳)

''ہمارے شیخ ابوالحسن نے خوارج کے متفقہ عقائد کی جو فہرست بیان کی ہے وہ کعبی کی بیان کردہ فہرست سے مختلف ہے' کیونکہ کعبی نے مرتکب کبیرہ کی تکفیر پر خوارج کا اتفاق نقل کیا ہے' جبکہ ہمارے شیخ کی بیان کردہ فہرست میں خوارج کے متفقہ عقائد میں تکفیر مرتکب کبیرہ کا مسئلہ شامل نہیں ہے۔وہ فہرست درج ذیل ہے: حضرت علی' حضرت عثمان' اصحابِ جمل' حکمین' (عمرو بن العاص و ابوموسیٰ اشعری) رضی اللہ عنہم تحکیم پر رضامندی کا اظہار کرنے والے' حکمین کی تصویب کرنے والے کی تکفیر اور ظالم سلطان کے خلاف خروج کا وجوب۔ہمارے شیخ ابوالحسن نے جو کچھ خوارج کے بارے میں نقل کیا ہے وہی صحیح ہے' کیونکہ خوارج کا فرقہ ''نجدات'' اپنے پیروکاروں میں سے ان لوگوں کی تکفیر نہیں کرتا جو ان گناہوں کے مرتکب ہوں جن پر حد لگائی جاتی ہے۔اسی طرح خوارج کے ایک اور فرقہ کے نزدیک ان گناہوں کے ارتکاب پر انسان کی تکفیر کی جائے گی جن کے بارے میں کوئی مخصوص وعید شارع کی طرف سے نہیں آئی ہے اور جن گناہوں پر کوئی حد یا قرآن مجید میں کوئی وعید آئی ہے ان کا مرتکب اسی نام سے موسوم ہوگا جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے مثلاً زانی' سارق وغیرہ۔فرقہ نجدات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ان کے پیروکاروں میں سے مرتکب کبیرہ نعمت خداوندی کا کافر ہوگا نہ کہ دین خداوندی کا''۔

ایک اور مقام پر عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے:

وقد زعمت فرقة من الصفریة ان ما کان من الاعمال علیه حد واقع لا یسمی صاحبه الا بالاسم الموضوع له کزان وسارق وکاذبٍ وقاتل عمدٍ ولیس صاحبه

كافرًا ولا مشركًا. وكل ذنب ليس فيه حد كترک الصلوٰة والصوم فهو كفر وصاحبه كافر .....وفرقة ثالثة من الصفرية قالت بقول من قال من البيهسية ان صاحب الذنب لا يحكم عليه بالكفر حتى يرفع الى الوالى فيحده.

فصارت الصفرية على هذا التقدير ثلاث فرق. فرقة تزعم ان صاحب كل ذنب مشرک كما قالت الازارقة. والثانية تزعم ان اسم الكفر واقع على صاحب ذنب ليس فيه حد والمحدود فى ذنبه خارج عن الايمان وغير داخل فى الكفر. والثالثة تزعم ان اسم الكفر يقع على صاحب الذنب اذا حده الوالى على ذنبه[۱۰۴]

''خوارج کے فرقہ صفریہ میں سے ایک فرقے کا خیال ہے کہ جن گناہوں کے بارے میں گناہگار پر حد کا ذکر ہوا ہے اس کا مرتکب اسی نام سے موسوم ہوگا جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے مثلاً زانی' سارق' قاذف اور قاتل عمد۔ اور اس کا مرتکب کافر اور مشرک نہیں ہوگا اور جس گناہ کے ارتکاب پر کسی حد کا ذکر نہیں ہوا مثلاً نماز اور روزہ کا چھوڑنا' وہ گناہ کفر اور اس کا کرنے والا کافر ہے۔

اور صفریہ کے ایک تیسرے فرقے کا کہنا ہے کہ مرتکب کبیرہ پر جب تک حاکم حد نہ جاری کر دے اس وقت تک اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ یہ عقیدہ خوارج کے فرقہ بیہسیہ کا بھی ہے۔[۱۰۵]

اس تقدیر پر صفریہ کے تین فرقے بن جاتے ہیں۔ (۱) ایک فرقے کا خیال ہے کہ ہر گناہگار مشرک ہے جیسا کہ خوارج کے فرقہ ازارقہ کا عقیدہ ہے (۲) دوسرے فرقے کا عقیدہ ہے کہ اس گناہ کے ارتکاب پر کفر کا اطلاق ہوگا جس کے ارتکاب پر کوئی حد نہیں ہے۔ محدود فی الذنب ایمان سے تو خارج ہے لیکن کفر میں داخل نہیں۔ (۳) تیسرے فرقے کا خیال ہے کہ گناہگار پر کفر کا اطلاق اس وقت کیا جائے گا جب حاکم اس پر حد جاری کر دے۔''

معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ کی تکفیر کا مسئلہ خوارج کا متفقہ عقیدہ نہیں بلکہ اس بارے میں ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک

اہل السنۃ والجماعۃ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کی موجودگی میں گناہگار آدمی مؤمن ہی رہتا ہے۔ ارتکابِ معاصی کی وجہ سے کوئی ایمان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتا' وہ اسی طرح مؤمن ہی رہے گا اور اللہ عزوجل کی مشیت میں رہے گا۔ چاہے تو اس کے گناہ ابتداءً ہی معاف فرما کر اپنے فضل و رحمت سے اس کو جنت میں بھیج دیں' چاہے گناہوں کی سزا کاٹنے اور گناہوں سے پاک ہونے کی خاطر کچھ عرصہ کے لیے جہنم میں ڈال دے' پھر گناہوں کے بقدر سزا بھگت کر اور پاک صاف ہونے کے بعد جنت میں بھیج دے۔ بہرحال وہ مخلد فی النار نہیں ہوگا۔ چنانچہ صاحب **الجوهرة المنيفة**

فی شرح وصیة الامام الاعظم ابی حنیفه ملاحسین بن اسکندر الحنفی نے امام صاحب کے قول ''العاصون من اُمّة محمدﷺ کلهم مؤمنون ولیسوا بکافرین'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

أقول : ان العبد المؤمن لا یکون کافرا بالفسق والمعصیة لان الایمان اقرار و تصدیق والاقرار والتصدیق باقٍ فیکون الایمان باقیا الا ان تکون المعصیة موجبا للکفر فیکون الایمان زائلاً لان الکفر یزیل الایمان(۱۰۶)

''میں کہتا ہوں بندۂ مؤمن فسق اور معصیت کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا کیونکہ ایمان اقرار اور تصدیق کا نام ہے اور معصیت کے ہوتے ہوئے اقرار وتصدیق باقی رہتے ہیں' لہٰذا ایمان باقی رہے گا سوائے اس کے اگر معصیت موجب للکفر ہو تو اس سے ایمان زائل ہو جائے گا' کیونکہ کفر ایمان کو زائل کر دیتا ہے''۔

امام ابوحنیفہ الفقہ الاکبر میں لکھتے ہیں:

ولا نکفر مسلمًا بذنب من الذنوب وان کانت کبیرة اذا لم یستحلها ولا نزیل عنه اسم الایمان ونسمیه مؤمنا حقیقة ویجوز ان یکون مؤمنا فاسقا غیر کافر(۱۰۷)

''ہم کسی بھی گناہ کے ارتکاب پر چاہے وہ کبیرہ ہو کسی مسلمان کی تکفیر نہیں کرتے بشرطیکہ وہ اس گناہ کو حلال نہ سمجھتا ہو۔ اس سے ہم ایمان کا ازالہ نہیں کرتے بلکہ ہم اسے مؤمن حقیقی کہتے ہیں' کیونکہ کوئی مؤمن فاسق ہو سکتا ہے کافر نہیں۔''

اور امام ابوالحسن اشعری نے لکھا ہے:

وندین بان لا نکفر احدا من اهل القبلة بذنب یرتکبه کالزنا والسرقة وشرب الخمور کما دانت بذٰلک الخوارج وزعمت انهم کافرون. ونقول : ان من عمل کبیرة من هذه الکبائر مثل الزنا والسرقة وما اشبهها مستحلا لها غیر معتقد لتحریمها کان کافرًا(۱۰۸)

''اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم اہل قبلہ میں سے زنا' چوری اور شراب نوشی جیسے کبائر کے مرتکب کی تکفیر نہیں کرتے' جیسا کہ یہ خوارج کا عقیدہ ہے کہ ان کے نزدیک وہ کافر ہے۔ اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ زنا اور چوری جیسے کبائر کا مرتکب صرف اس وقت کافر گردانا جائے گا اگر وہ ان کبائر کی حرمت کا عقیدہ نہیں رکھتا بلکہ حلال سمجھتا ہے۔''

ابومنصور ماتریدی نے شرح الفقہ الاکبر میں لکھا ہے:

ومن الدلیل علی ان الایمان لا یرفع بالکبیرة قول اللّٰه تعالی : ﴿اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا﴾ أمر بالتثبت فی نبأ الفاسق فلو صار کافرًا لنهی عن قبول شهادته.

وحديث ماعز بن مالک ایضًا حجة حین اقر بالزنا بین یدی رسول اللہ ﷺ فلو صار مرتدًا لامر بقتلہ او استرجعہ الی الاسلام والمعنی فیہ ھو ان الایمان محلہ القلب والمعاصی محلھا الاعضاء وھما فی محلین مختلفین فلا یتنافیان(۱۰۹)

''گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے ایمان ختم نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا درج ذیل ارشاد بھی ہے ﴿اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا﴾ آیت کریمہ میں اللہ عزوجل نے فاسق کی دی ہوئی خبر کے بارے میں تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے (ردّ کرنے کا نہیں) اگر وہ غلط خبر دینے کی وجہ سے مرتد ہوتا تو اس کی شہادت قبول کرنے سے روکا جاتا۔ دوسری دلیل حدیث ماعز بن مالکؓ ہے جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے زنا میں ملوث ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اگر ارتکابِ زنا کی وجہ سے وہ مرتد ہوتا تو آپ ﷺ یا تو اس کے قتل کرنے کا حکم فرماتے یا اس کو اسلام کی طرف واپس لوٹنے کا حکم دیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایمان کا محل قلب ہے اور معاصی کا محل اعضاء۔ اور دونوں کا محل وقوع مختلف ہے لہٰذا دونوں میں کوئی منافاۃ نہیں۔''

'' محلِ ایمان قلب ہے' کیونکہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں جہاں کہیں ایمان کا ذکر کیا ہے اس کی اضافت قلب کی طرف کی ہے۔ چند آیات بینات ملاحظہ ہوں:

﴿مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاھِھِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُھُمْ﴾ (المائدۃ:۴۱)

﴿مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْم بَعْدِ اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ﴾ (النحل:۱۰۶)

﴿اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ﴾ (المجادلۃ:۲۲)

﴿وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (الحجرات:۱۴)

﴿وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (الحجرات:۷)

'' مندرجہ بالا آیات بینات سے معلوم ہوا کہ محلِ ایمان دل ہے' لہٰذا معاصی (جن کا محل اعضاء ہے) کے ساتھ اس کا اجتماع ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں جابجا مرتکب کبائر پر مؤمن کا اطلاق کیا ہے۔ مثلاً مؤمنوں کے باہم مقاتل دونوں فریق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

(۱) ﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا فَاِنْم بَغَتْ اِحْدٰىھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ﴾ (الحجرات:۹)

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں باہم مقاتل فریقین کو مؤمنوں کے دو فرقے کہا گیا ہے۔

(۲) ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

مندرجہ بالا آیت کریمہ میں قاتل عمد کو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۳) ﴿فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ﴾ (البقرۃ:۱۷۸)

مندرجہ بالا آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر قاتل کو اپنے بھائی (ولی مقتول) کی طرف سے قصاص سے معافی مل جائے۔ اس طرح قاتل کو باوجود قتل کے ولی مقتول کا بھائی کہا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ اخوت نسبی نہیں بلکہ ایمانی ہے بفحوائے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ لہٰذا معلوم ہوا کہ قاتل باوجود قتل کے مؤمن ہے۔

(۴) ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا﴾ (الانفال:۷۲)

اس آیت کریمہ میں ہجرت نہ کرنے والے کو بھی مؤمن کہا گیا ہے حالانکہ قرآن مجید میں ترکِ ہجرت پر عظیم وعید سنائی گئی ہے جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ (النحل:۲۸) نیز فرمایا ﴿مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا﴾ (الانفال:۷۲) باوجود ان دو عظیم وعیدوں کے ان کو مؤمن کہا گیا۔

(۵) ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ (التحریم:۸)

اس آیت کریمہ میں مؤمنین کو توبہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ کا حکم گناہگار ہی کو دیا جاتا ہے۔

(۶) ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ (الممتحنة:۱)

اس آیت کریمہ میں اللہ کے دشمن کو دوست بنانے والوں کو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا ہے۔

یہ اور ان جیسی بے شمار دیگر آیات بینات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کسی نے کوئی ایسا گناہ کیا کہ جس کی وجہ سے یہ سمجھا جائے کہ اس میں تصدیق موجود نہیں تو بے شک اس گناہ کی وجہ سے وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی بد بخت رسول اللہ ﷺ کی شانِ مبارک میں گستاخی کا مرتکب ہوا یا کسی نے قرآن مجید کو نجاست میں پھینک دیا یا کسی بت کے آگے سجدہ کیا تو ان گناہوں کی وجہ سے اس کو کافر گردانا جائے گا۔ چنانچہ علامہ تفتازانی نے **شرح العقائد النسفیة** میں لکھا ہے:

ولا نزاع فی ان من المعاصی ما جعله الشارع امارة للتکذیب وعلم کونه کذٰلک بالادلة الشرعیة کسجود الصنم والقاء المصحف فی القاذورات والتلفظ بکلمات الکفر ونحو ذٰلک مما ثبت بالادلة انه کفر[۱۱]

''اور اس میں کوئی نزاع اور اختلاف نہیں کہ کچھ گناہ ایسے ہیں جن کو شریعتِ مطہرہ نے دلائل کی بنیاد پر تکذیب کی علامت قرار دیا ہے مثلاً بت کے آگے سجدہ کرنا' قرآن مجید کو گندگی میں پھینکنا' کفریہ کلمات اور ایسے کلمات جن کا کفر ہونا دلائل شرعیہ سے ثابت ہے' کو زبان سے ادا کرنا۔''

پھر اہل السنّت والجماعت کے درمیان ایمان کی تعبیر میں اختلاف ہوا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

وھو قول وفعل

''ایمان قول وفعل دونوں کا نام ہے''۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، جمہور محققین اور متکلمین کی تعبیر:

الایمان ھو الاقرار باللسان والتصدیق بالجنان(۱۱۱)

''ایمان زبانی اقرار اور دلی تصدیق کا نام ہے''۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے:

واما فی الشرع فھو التصدیق بما علم مجیٔ النبی ﷺ به ضرورة تفصیلاً فیما علم تفصیلا واجمالاً فیما علم اجمالاً وھذا مذھب جمھور المحققین لکنھم اختلفوا فی ان مناط الاحکام الاخرویة مجرد ھذا المعنی ام مع الاقرار؟ فذھب الاشعری واتباعه الی ان مجرد ھذا المعنی کاف لانه المقصود والاقرار انما ھو لیعلم وجوده فانه امر باطن ویجری علیه الاحکام فمن صدق بقلبه وترک الاقرار مع تمکنه منه کان مؤمنا شرعا فیما بینه وبین الله تعالی ویکون مقره الجنة لکن ذکر ابن الھمام ان اھل ھذا القول اتفقوا علی انه یلزم ان یعتقد انه متی طلب منه الاقرار اتی به فان طولب ولم یقر فھو کفر عناد.

وذھب امامنا ابوحنیفة رحمه اللّٰه وغالب من تبعه اِلٰی ان الاقرار وما فی حکمه کاشارة الاخرس لابد منه فالمصدق المذکور لا یکون مؤمنا ایمانا یترتب علیه الاحکام الاخرویة کالمصلی مع الریاء فانه لا تنفعه صلوته(۱۱۲)

''ایمان کا شرعی معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جن چیزوں کا ثبوت بدیہی طور پر ہوا ہے اس کی تصدیق کرنا ایمان ہے' اگر حضور اکرم ﷺ سے ثبوت تفصیلی ہے تو تفصیلی تصدیق اور اجمالی ہے تو اجمالی تصدیق ضروری ہے۔ یہ جمہور محققین کا مذہب ہے۔ (اس حد تک تو ان کا اتفاق ہے) اس کے بعد ان کا اختلاف ہے اس بارے میں کہ احکام اخرویہ کے لیے مدار صرف یہی تصدیق ہے یا اس کے ساتھ اقرار لسانی بھی ضروری ہے؟ ابوالحسن اشعری اور اس کے پیروکاروں کا مذہب یہ ہے کہ یہی تصدیق کافی ہے اقرار کی ضرورت نہیں' اس لیے کہ اصل مقصود تو تصدیق قلبی ہے اور اقرار کی ضرورت تو صرف اس تصدیق قلبی کی موجودگی کا یقین حاصل کرنے کے لیے ہے جو امر باطنی ہے

اوراس پر احکام کے اجراء کا مدار ہے۔ لہٰذا جس کو تصدیق قلبی حاصل ہے اور باوجود قدرت کے وہ اقرار نہیں کرتا وہ بھی اللہ کے نزدیک مؤمن ہے اور اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ لیکن علامہ ابن الہمام نے لکھا ہے کہ قول مذکور کے قائلین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ اس بات کا عقیدہ بھی رکھنا لازم ہے کہ عندالطلب وہ اقرار لازماً کرے گا' اگر کسی نے عندالطلب اقرار نہ کیا تو یہ کفر عناد ہے۔(۱۱۳)

امام ابوحنیفہ اوران کے اکثر پیروکاروں کا مذہب ہے کہ اقرار اور اقرار کے قائم مقام (مثلاً گونگے کا اشارہ کرنا) کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا تصدیق کنندہ (اقرار پر قدرت رکھتے ہوئے بھی اقرار نہ کرنے والا) مؤمن نہیں۔ ایسے ایمان پر اخروی احکام کا ترتب نہیں ہوگا۔ یہ ایمان اس کے کسی کام نہیں آئے گا جس طرح ریاء سے نماز پڑھنے والے کو اس کی نماز سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔''

خلاصہ یہ کہ امام اعظم اور متکلمین کے نزدیک ایمان تصدیق قلبی اور اقرار باللسان کا نام ہے۔ باقی رہا یہ کہ اقرار باللسان رکن ایمان ہے یا شرط؟ امام طحاوی نے تو امام صاحب سے اقرار کا رکن ہونا نقل کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

والایمان : هو الاقرار باللسان والتصديق بالجنان(۱۱۴)

''ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے۔''

اسی طرح **کتاب الوصیہ للامام الاعظم ابی حنیفۃ** میں ہے:

الايمان: اقرار باللسان' وتصديق بالقلب' والاقرار وحده لا يكون ايماناً' لانه لو كان ايمانا لكان المنافقون كلهم مؤمنين وكذلك المعرفة وحدها لا تكون ايمانا' لانها لو كانت ايماناً لكان اهل الكتاب كلهم مؤمنين' قال اللّٰه تعالىٰ فى حق المنافقين ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ وقال فى حق اهل الكتاب ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ﴾(۱۱۵)

''ایمان زبانی اقرار اور قلبی تصدیق کا نام ہے اکیلا اقرار ایمان نہیں' کیونکہ اگر اکیلا اقرار ایمان ہوتا تو تمام منافق مؤمن ہوتے۔ اسی طرح اکیلی معرفت بھی ایمان نہیں' کیونکہ اگر صرف معرفت کا نام ایمان ہوتا تو تمام اہل کتاب مؤمن ہوتے۔ حالانکہ منافقین کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں) اور اہل کتاب کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ﴾ یعنی وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو ایسے جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔''

اور عقائد نسفیہ میں ہے:

الايمان هو التصديق بما جاء من عند الله والاقرار(۱۱۶)

''ایمان منجانب اللہ آمدہ تمام تر اشیاء کی تصدیق اوران کے اقرار کرنے کا نام ہے۔''

امام صاحب سے ایک اورقول یہ بھی منقول ہے کہ اقرار رکن نہیں بلکہ شرط ہے جو اکراہ کے وقت ساقط ہوجاتا ہے۔(۱۱۷)

سابقہ حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ امام اعظم کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام نہیں بلکہ قلبی تصدیق اور زبانی اقرار دونوں کو ایمان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جہم بن صفوان سے امام صاحب کا جومناظرہ ہوا تھا (جس کا ابتدائی حصہ ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں) یہ مناظرہ علامہ مکی نے المناقب میں نقل کیا ہے۔اس وقت میرے سامنے ''حیات امام ابی حنیفہ'' ابوزہرہ مصری کی کتاب کا اردو ترجمہ غلام احمد حریری صاحب کا ہے۔اس میں امام صاحب نے اپنے اس مسلک کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیے تھے وہ درج ذیل تھے:

(۱) ﴿وَاِذَاسَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَ نَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (المائدۃ)

''اور جب وہ آیاتِ قرآنی سنتے ہیں تو معرفتِ حق کی وجہ سے ان کے آنسو بہنے لگتے ہیں' اور وہ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے سو ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ہم اللہ اور اس کے نازل کردہ حق وصدق کو نہ مانیں' اور ہم امیدوار ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں نیکوکاروں میں داخل فرمائے گا۔اس قول کی وجہ سے اللہ نے انہیں جنت عطا کی جس میں نہریں بہتی ہیں' اس میں ہمیشہ رہیں گے' اور نیکوکاروں کا بدلہ یہی ہے''۔

امام صاحب نے فرمایا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معرفت واقرار کی وجہ سے انہیں جنتی فرمایا ہے اور دل وزبان سے ماننے کے باعث مؤمن قرار دیا ہے۔

(۲) ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (البقرۃ:۱۳۷)

''تم کہو ہم اللہ اور اس کی نازل کردہ آیات پر ایمان لائے اور جو ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اوراسباط واحفاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ وعیسیٰ ودیگر انبیاء کرام (علیہم السلام) کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا کیا گیا۔ہم ان میں فرق مدارج قائم نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے تابع ہیں۔سو اگر وہ تمہاری طرح ایمان لے آئے تو وہ ہدایت یافتہ ہوئے۔''

(۳) ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾(الفتح:۲٦)
''اور لازم کر دیا ان پر کلمہ تقویٰ۔''
(۴) ﴿وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ﴾(الحج:۲٤)
''انہیں پاکیزہ باتوں کی ہدایت کی گئی۔''
(۵) ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾(الفاطر:۱۰)
''اس کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں''۔
(٦) ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ﴾ (ابراھیم:۲۷)
''اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو دنیوی زندگی اور آخرت میں قولِ ثابت کی وجہ سے ثابت قدم رکھتا ہے۔''
نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
(۷) ((قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا))
(۸) ((يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَكَانَ فِىْ قَلْبِهٖ كَذَا))
مذکورہ بالا حدیث میں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو دل سے معرفت خداوندی حاصل کرے وہ جہنم سے نکل جائے گا بلکہ فرمایا جو زبان سے یہ کلمات کہے اس کو جہنم سے نکلنا نصیب ہوگا۔ اگر قلبی معرفت کافی ہوتی اور اقرار لسانی کی حاجت نہ ہوتی تو زبان سے اللہ تعالیٰ کی تردید اور انکار کرنے والے دل سے اللہ کی معرفت حاصل کر کے مؤمن بن جاتے۔
(۹) اندریں صورت ابلیس کا مؤمن ہونا بھی کسی شبہ سے بالا ہوتا' کیونکہ معرفت خداوندی تو اسے حاصل ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق' مالک' مارنے والا' زندہ کرنے والا اور اس کو جادۂ مستقیم سے ہٹانے والا ہے' جیسا کہ خود اس نے کہا تھا: ﴿رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِىْ﴾ اور کہا تھا ﴿اَنْظِرْنِىْ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اقرار کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾.
(۱۰) علاوہ ازیں اگر اللہ کی صرف معرفت موجبِ ایمان ہوتی تو کافر حصولِ معرفت کے بعد زبان سے منکر ہونے کے علی الرغم مؤمن ہوتے' حالانکہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ﴾(النمل:۱٤) یعنی یقین کرنے کے باوجود انہوں نے انکار کیا۔
مندرجہ بالا آیت کریمہ میں وحدانیت کا یقین رکھنے کے باوجود زبان سے منکر ہونے کی وجہ سے ان کو مؤمن نہیں کہا گیا۔
(۱۱) ﴿يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (النحل:۳)
''یعنی یہ اللہ کی نعمتوں کو پہچان کر انکار کر دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر تو بالکل نہیں مانتے''۔

(۱۲)﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ﴾ (یونس:۳۲)

''آپ فرما دیجیے کہ تمہیں زمین و آسمان سے رزق کون پہنچاتا ہے یا کان اور آنکھ کس کے قبضہ میں ہیں اور زندے کو مردہ اور مردے کو زندہ سے کون نکالتا ہے؟ جملہ امور کس کے زیر تصرف ہیں؟ تو وہ جواب میں کہیں گے یہ سب تصرفات اللہ کے قبضے میں ہیں۔ پھر ان سے پوچھئے کہ تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں؟ پس یہی تمہارا خدا ہے جو پروردگار حقیقی ہے۔ پس حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا ہے؟''

مندرجہ بالا آیاتِ بینات سے واضح ہوتا ہے کہ انکار کی موجودگی میں معرفت قطعی طور سے بے کار ہے۔

(۱۳)﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ﴾ (البقرۃ:۱٤٦)

''وہ آپ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کو رسول اللہ ﷺ کا پہچان لینا کافی نہ تھا جبکہ وہ آپؐ کی نبوت و رسالت کو نہیں مانتے تھے اور انہوں نے اس واضح حقیقت پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ جب امام صاحب یہ دلائل بیان کر چکے تو جہم نے کہا کہ آپ نے میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ میں پھر لوٹ کر حاضر خدمت ہوں گا۔(۱۱۸)

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''الانتقاء'' میں ایمان اور اس کی اقسام بیان کرتے ہوئے امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ ایمان معرفت الٰہی' اس کی تصدیق اور اقرار کرنے کا نام ہے۔ تصدیق کے اعتبار سے انسانوں کے تین درجے ہیں:

(۱) جو دل اور زبان سے اللہ تعالیٰ اور اس کے نازل کردہ احکام کی تصدیق کرتا ہے۔

(۲) جو زبان سے تصدیق کرتا ہے اور دل سے جھٹلاتا ہے۔

(۳) جو دل سے تصدیق کرتا ہے اور زبان سے تکذیب کرتا ہے۔

پہلا شخص اللہ اور مخلوق دونوں کے نزدیک مؤمن ہے' دوسرا شخص اللہ کے نزدیک کافر اور لوگوں کے نزدیک مؤمن ہے' کیونکہ لوگ اس کی قلبی کیفیت سے آگاہ نہیں اور شہادت کا اقرار کرنے کی وجہ سے وہ اسے مؤمن سمجھنے پر مجبور ہیں۔ انسان اس کے مکلّف نہیں کہ وہ دلوں کے حالات سے بھی واقف ہوں۔

جہاں تک تیسرے شخص کا تعلق ہے ممکن ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کی خاطر کفر کا اظہار کر رہا ہو اور جو شخص اسے نہیں جانتا وہ اسے کافر سمجھنے لگے اور ہو سکتا ہے عنداللہ وہ مؤمن ہو۔(۱۱۹)

خلاصہ یہ کہ حضرات متکلمین اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک عمل ثمرہ اور نتیجہ ایمان ہے' ایمان کی حقیقت کا جزو نہیں۔

ائمہ ثلاث اور محدثین کی تعبیر:

الایمان معرفة بالقلب، و اقرار باللسان وعمل بالارکان(۱۲۰)

''ایمان قلبی معرفت، زبانی اقرار اور جوارح سے عمل کرنے کا نام ہے''۔

(جاری ہے)

حواشی

(٦٥) لسان العرب، ابن منظور الافریقی، ۲۱/۱۳۔

(٦٦) ایضًا۔

(٦٧) لسان العرب، ۲۳/۱۳۔

(٦٨) تفسیر الکشاف، ۳۸/۱۔

(٦٩) تفسیر الکشاف، ۳۸/۱۔

(۷۰) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، محمود آلوسی، ۱۱۰/۱۔ آیت ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ.....﴾

(۷۱) کتاب التعریفات، للجرجانی اورکشاف اصطلاحات الفنون محمد اعلی التھانوی بذیل تصدیق۔

(۷۲) شرح المقاصد، مسعود بن عمر، التفتازانی، تقسیم العلم الی تصدیق و تصور، ۱۹۸/۱۔

(۷۳) روح المعانی، ۱۱۱/۱ آیت ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ.....﴾

(۷٤) تفسیر روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ۱۱۰/۱۔ آیت ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ.....﴾

(۷۵) نیز شرح العقائد، ص ۳۹۲۔

(۷٦) تفسیر مفاتیح الغیب، امام فخر الدین رازی، تفسیر آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ.....﴾

(۷۷) تفسیر کبیر، فخر الدین ،رازی، تفسیر سورة البقرة، آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ.....﴾

(۷۸) السیرة النبویة لابن ھشام، ۳۰٦/۱ تا ۳۱۱، شعر ابی طالب فی معاداة خصومہ، دار الریان للتراث، قاھرہ، طبع، ۱۹۸۷/۱٤۰۸ء۔

(۷۹) الاصابہ فی تمییز الصحابة، ۱۱٦/٤، دار احیاء التراث، الطبعة الاولی، ۱۳۲۸ھ۔

(۸۰) تفسیر قرطبی، جزء ٦۔ الانعام: ۲٦، ص ۲٦۱ و ۲٦۲، دار الکتب العلمیة، بیروت۔

(۸۱) فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قصة ابی طالب، ۲٤۳/۷، دارالسلام، ریاض، مطبوعہ ۱٤۲۱ھ/۲۰۰۰ء۔

(۸۲) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ وقول اللہ عزوجل ذکرہ انا اوحینا الیك کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ۔ وصحیح مسلم، باب کتاب

النبیﷺ الی ھرقل یدعوہ الی الاسلام۔ وصحیح ابن حبان' باب ذکر وصف کتاب النبیﷺ۔

(۸۳) فضل الباری شرح صحیح البخاری' علامہ شبیر احمد عثمانی' ۱/۲۴۳۔

(۸۴) المنہاج شرح صحیح مسلم' کتاب الجہاد والسیر' باب کتاب النبیﷺ الی ھرقل ملك الشام یدعوہ الی الاسلام' ۱۱/۳۲۶۔ دار المعرفۃ' بیروت' الطبعۃ الثالثۃ' ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء۔

(۸۵) کشف الاستار عن زوائد البزار' ذکر نبینا محمد (ﷺ) باب فیما کان عند اھل الکتاب من علامات نبوتہ ۳/۱۱۸۔

(۸۶) تفسیر قرطبی' جزء ۶' سورۃ الانعام آیت ۲۶'ص ۲۶۲' دارالکتب العلمیۃ' بیروت۔

(۸۷) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام' شعر ابی طالب فی معاداۃ خصومہ' ۱/۳۱۱۔

(۸۸) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی صحۃ اسلام من حضرہ الموت' مالم یشرع فی النزع ونسخ جواز الاستغفار للمشرکین۔ وسنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہﷺ' باب من سورۃ القصص۔ ومسند الامام احمد بن حنبل' مسند بنی ھاشم ومسند ابی ھریرۃ' رقم الحدیث (۹۳۹۷)۔ وشعب الایمان' الأول من شعب الایمان' ۸۹۔ودلائل النبوۃ باب وفاۃ ابی طالب ۶۲۳۔

(۸۹) تفسیر مفاتیح الغیب' سورۃ البقرۃ' آیت ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ.....﴾ والفرق بین الفرق' عبدالقاھر البغدادی' ص ۱۹۹۔مطبعہ دار الآفاق الجدیدۃ' بیروت۔ جہم بن صفوان' فرقہ جبریہ اس کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ اس مذہب کا پرزور داعی اور مددگار تھا۔عقیدہ جبریہ کے دوش بدوش وہ چند اور نظریات کا بھی پرزور مبلغ تھا مثلاً: (۱) جنت اور دوزخ بالآخر فنا ہوں گے' کوئی شے دائمی وابدی نہیں' قرآن میں جس خلود کا ذکر ہے اس سے مراد طول مدت ہے دوام وبقاء نہیں۔ (۲) ایمان صرف اللہ کی معرفت اور کفر صرف جہل کا نام ہے۔ بنابریں جو یہودی نبی کریمﷺ کے اوصاف سے باخبر تھے وہ مؤمن تھے۔ اس طرح وہ مشرک جو بکمال یقین واذعان آنحضورﷺ کے اوصاف سے منکر تھے وہ بھی ایمان سے بہرہ ور تھے۔ بقول جہم یقین واذعان معرفت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جس معرفت کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ معرفت تو یہ ہے جو تصدیق واذعان کی موجب ہو (۳) وہ خلق قرآن کا قائل تھا۔ (۴) وہ اللہ کو اشیاء میں داخل نہیں سمجھتا تھا اور نہ یہ کہتا کہ خدا زندہ ہے۔ وہ کہتا تھا: میں خدا کو ان صفات سے متصف نہیں کرتا جن کا اطلاق حوادث پر ہوسکے۔ (۵) وہ بروز قیامت دیدارِ خداوندی کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

(۹۰) حیات ابی حنیفہ' اردو ترجمہ غلام احمد حریری' ملک سنز فیصل آباد' ص ۲۷۷ تا ۲۸۲۔

(۹۱) محمد بن کرام کی طرف منسوب ایک گمراہ فرقہ جن کے گمراہ کن افکار ونظریات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) معبود کی تجسیم زعم انہ جسم لہ حَدٌّ ونہایۃ من تحتہ والجہۃ التی منہا یلاقی عرشہ۔

(۲) ان اللہ مماس لعرشہ وان العرش مکان لہ یہ اور ان جیسے دیگر عقائد باطلہ کے لیے دیکھئے الفرق بین الفرق' ص ۲۰۲ تا ۲۱۴۔

(۹۲) الفرق بین الفرق' ص ۲۱۲۔

(۹۳) روح المعانی : مبحث فی الایمان' ج ۱'ص ۱۱۱۔

(۹٤) تفسیر کبیر، سورۃ البقرۃ، آیت ۳۔

(۹۵) مرجئہ کا اطلاق دو فرقوں پر ہوتا ہے (۱) وہ فرقہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات اور ان تنازعات کے بارے میں جو اُموی عہد میں ظہور پذیر ہوئے غیر جانبدار تھا (۲) وہ فرقہ جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ کفر کے ماسوا اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کر دے گا، لہٰذا ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت کا کوئی نقصان نہیں، جیسے کفر کی موجودگی میں طاعت کا کوئی فائدہ نہیں، ایمان و عمل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان میں سے بعض فرقے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر کہنے لگے کہ ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ زبان سے کفر کا اعلان کرنے، بتوں کی پرستش کرنے، یہودیت و نصرانیت کا عقیدہ رکھنے اور صلیب کی پوجا کرنے سے بھی ایمان جوں کا توں رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص دار الاسلام میں رہتے ہوئے تثلیث کا عقیدہ رکھتا ہو اور اس حالت میں مر جائے تو وہ خدا کے ہاں مؤمن کامل اور جنتی ہوگا۔ ملاحظہ ہو الفصل فی الملل والاهواء والنحل، ابن حزم، ج ٤، ص ۲۰٤۔ بعض مرجئہ یہ کہتے تھے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے معلوم ہے کہ اللہ نے خنزیر کھانا حرام کیا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ خنزیر ہے یا بکری یا کچھ اور تو مؤمن رہے گا۔ یا کوئی یوں کہے کہ اللہ نے حج بیت اللہ فرض کیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ کعبہ کہاں واقع ہے، ممکن ہے وہ ہندوستان میں ہو، تو بھی مؤمن ہے، ملاحظہ ہو الملل والنحل (شهرستانی)، ج ۱، ص ۲۲۵۔

(۹٦) تفسیر مفاتیح الغیب، امام فخر الدین رازی، تفسیر سورۃ البقرۃ، آیت ۳۔

(۹۷) شرح الفقه الاکبر، ابو منصور ماتریدی، ص ۵۔

(۹۸) کتاب الأبانة عن اصول الدیانة، باب فی ابانة قول اهل الزیغ والبدعة۔

(۹۹) کتاب الأبانة، باب فی ابانة قول اهل الحق والسنة۔

(۱۰۰) الجوهرة المنیفة فی شرح وصیة الامام الاعظم ابی حنیفة، ملا حسین بن اسکندر الحنفی، فصل العمل غیر الایمان۔

(۱۰۱) الفرق بین الفرق، عبدالقاهر البغدادی، الفصل الثانی من فصول هذا الباب فی بیان مقالات فرق الخوارج، ص ۵۵۔

(۱۰۲) شرح العقائد النسفیه، ص ۸۲ المطبع الیوسفی فرنگی محلی۔

(۱۰۳) الفرق بین الفرق، ص ۵٦، ۵۷۔

(۱۰٤) الفرق بین الفرق، ص ۷۵۔

(۱۰۵) چنانچہ عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے: قالت البیهسیة ان من واقع ذنباً لم نشهد علیه بالکفر حتی یرفع الی الوالی ویحد ولا نسمیه قبل الرفع الی الوالی مؤمنا ولا کافرا۔ الفرق بین الفرق، ص ۸۸۔

(۱۰٦) الجوهرة المنیفة فی شرح وصیة الامام الاعظم ابی حنیفة، ملا حسین بن اسکندر الحنفی، فصل المؤمن لا یکفر بالفسق۔

(۱۰۷) الفقه الاکبر مع شرح احمد بن محمد المغنیساوی۔

(۱۰۸) الابانة عن اصول الديانة' ابوالحسن الاشعری' باب فی ابانة قول اهل الحق والسنة۔ والعقيدة الطحاوية' ص ١٦۔

(۱۰۹) شرح الفقه الاكبر' ص ۷۔

(۱۱۰) شرح العقائد النسفيه' ص ۸۳۔ مطبع يوسفی' فرنگی محلی۔

(۱۱۱) كتاب الفقه الاكبر' فصل الفرق بين الاسلام والايمان۔

(۱۱۲) تفسير روح المعانی' تفسير آيت ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ .....﴾

(۱۱۳) علماء نے کفر کی چار قسمیں بیان کی ہیں: (۱) کفر انکار (۲) کفر جحود (۳) کفر عناد (۴) کفر نفاق۔ کفر انکار: نہ دل میں تصدیق اور نہ زبان سے تسلیم واقرار' مثلاً عام کافروں کا کفر۔ کفر جحود: دل سے تصدیق اور ایمان کی حقانیت سمجھنا مگر زبان سے انکار' مثلاً ابلیس کا کفر۔ کفر عناد: دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار لیکن شریعت کی التزام طاعت نہیں کرتا۔ استسلام وانقیاد باطنی کو قبول نہیں کرتا' اپنی باگ ڈور رسول ﷺ کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں' مثلاً ابوطالب اور ہرقل کا کفر۔ کفر نفاق: زبان سے اقرار اور التزام طاعت کا اظہار لیکن دل میں انکار موجود ہو۔

(۱۱٤) العقيدة الطحاوية' ص ۱۸۔

(۱۱٥) كتاب الوصية للامام الاعظم ابی حنيفة' فصل فی حقيقة الايمان۔

(۱۱٦) العقائد النسفية' فصل الفرق بين الايمان والاسلام۔

(۱۱۷) اتحاف السادة المتقين' ج۲' ص ۲٤۱۔

(۱۱۸) المناقب للمكی' ج۱' ص ۱٤٥ تا ۱٤۸۔

(۱۱۹) الانتقاد لابن عبدالبر' ص ۱٦۸۔

(۱۲۰) اتحاف السادة المتقين' ج۲' ص ۲٤۱'۲٤۲۔

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : اکلوتا فرزند ذبیح۔اسحٰقؑ یا اسمٰعیلؑ؟

تصنیف : عبدالستار غوری۔ڈاکٹر احسان الرحمٰن غوری

ضخامت:324 صفحات قیمت:330 روپے ملنے کا پتہ:المورد'51۔کے'ماڈل ٹاؤن لاہور

اگر فیصلہ قرآن مجید پر چھوڑا جائے تو وہاں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں' کیونکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری سنائی گئی تو یہ بھی بتا دیا گیا کہ اسحٰق کے ہاں یعقوبؑ پیدا ہوگا۔ظاہر ہے کہ اسحٰق کے بعد ان کی اولاد کا بھی ذکر ہے تو وہ ذبیح کیسے ہو سکتے ہیں؟ جبکہ بائبل میں اس بات کی بتکرار تصریح ہے کہ قربانی اکلوتے بیٹے کی تھی۔تو یہ حقیقت شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اکلوتے بیٹے اسمٰعیلؑ ہی تھے' کیونکہ اسحٰق اُس وقت پیدا ہوئے جب اسمٰعیلؑ چودہ سال کے ہو چکے تھے۔چنانچہ ان تصریحات کے ہوتے ہوئے ہر سلیم الفطرت انسان اس حقیقت کو قبول کرلے گا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔

فاضل مصنفین نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ محنت کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے اور ہر اُس سوراخ کو بند کر دیا ہے جہاں سے شک وشبہ کے در آنے کی ادنیٰ سی گنجائش بھی نکل سکتی تھی۔فاضل محققین نے اپنا دعویٰ ''اکلوتا فرزند ذبیح اسماعیل'' ناقابل تردید اور محکم دلائل سے بڑی خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔فریق مخالف کے دعویٰ کے ابطال کے سلسلے میں ان ہی کے لٹریچر اور ذخیرۂ علمی سے مسکت جوابات دیے ہیں۔کتاب نہایت ہی مفید ہے۔یہودی اور مسیحی کمیونٹی میں اس کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔اُمید واثق ہے کہ خالی الذہن ہو کر پڑھنے والا فریق مخالف کا کوئی بھی فرد اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اس قدر جامع ہے کہ نہایت متعصب انسان بھی ذرا سے انصاف کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے' کیونکہ تمام تائیدی حوالہ جات معیاری اور مستند کتب سے دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک قابل قدر اضافہ ہے۔اس کی جتنی پذیرائی کی جائے' کم ہے۔مضبوط جلد' دبیز کاغذ اور عمدہ طباعت کی حامل یہ کتاب حسن ظاہری کے اعتبار سے بھی لائق تحسین ہے۔

(۲)

نام کتاب : قرآنی اردو

مصنف : لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

ضخامت:405 صفحات قیمت:450 روپے ملنے کا پتہ: بک کارنر، مین بازار، جہلم

کسی کتاب کا نام ''قرآنی اُردو'' ہو تو کون مسلمان ہوگا جسے اس عنوان پر تعجب نہ ہو اور جب اُسے یہ کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ تقریباً ۹۴ فیصد قرآنی الفاظ اردو کے استعمال میں ہیں تو اس کے حیرت و استعجاب میں اضافہ ہوگا۔ اس کتاب کے مصنف لیفٹیننٹ کرنل عاشق حسین ہیں، جن کا تعلق آرمی ایجوکیشن کور سے رہا ہے، اور اس وقت ڈسٹرکٹ جناح پبلک کالج، منڈی بہاؤالدین کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنے آرمی ایجوکیشن والے تجربے سے طلبہ کو فیض یاب کر رہے ہیں۔

اسے بجا طور پر مصنف نے ''اشتقاقی انسائیکلو پیڈیا'' کہا ہے۔ یہ اردو میں مستعمل قرآنی الفاظ کے بارے میں لسانی و ادبی تحقیق ہے۔ اس میں قرآن حکیم کے تقریباً بارہ سو ایسے لفظی مادوں کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے جو اُردو میں مستعمل ہیں۔ پھر ہر مادہ سے ماخوذ اُردو الفاظ کی نشاندہی کر کے بطور حوالہ ایسے اُردو اشعار بھی درج کیے گئے ہیں، جن میں وہ الفاظ (اصل یا ماخوذ حالت میں) استعمال ہوئے ہیں۔ اس کتاب کی مدد سے نہ صرف اُردو دان حضرات کو اپنی زبان کے حوالے سے قرآن کے غالب ذخیرۂ الفاظ کے مفاہیم کا ادراک ہو سکتا ہے، بلکہ اُردو زبان و ادب کے طلبہ بھی اُردو کے وافر ذخیرۂ الفاظ کی تفہیم و تعلیم کے سلسلے میں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

عربی زبان و ادب کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا ہے: عربی اور اردو کے اس اختلاط کو کرنل صاحب نے ''عربی گھٹی'' کا فیض قرار دیا اور اپنے مطالعے کی بنیاد پر اعتراف کیا کہ مذہب اور مسلم اقتدار ہی دو مضبوط عوامل تھے، جنہوں نے زبان اُردو کی صورت و سیرت کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ مؤلف نے اثر آفرینی کے عوامل کا احصاء بھی کیا ہے اور مستند تاریخی حوالوں سے اپنے دعوے کا ثبوت بھی مہیا کیا ہے۔ قرآنی کلمات کے اثرات ہمہ جہتی ہیں۔ رسم الخط سے لے کر الفاظ، علامات، تلمیحات بلکہ مجموعی ادبی مزاج تک ان اثرات کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کرنل صاحب نے اس سلسلے میں خوب محنت کی ہے اور اپنے مسلسل مطالعے اور پیہم غور و فکر سے اُردو کے طلبہ و اساتذہ کے لیے ایک ایسی لغت ترتیب دی ہے جو فہمِ قرآن کے لیے بھی معاون ہوگی اور اُردو کلمات و محاورات کی تفہیم کے لیے بھی رہبر بنے گی۔

اس تحقیق کے مطابق وہ قرآنی الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہیں، اُن کی تعداد تقریباً سینتالیس ہزار چار سو

سات (۴۰۷۴۷) ہے جو تقریباً ۱۱۹۷ مادوں (مصدروں) سے استخراج ہوئے ہیں۔ اس طرح ۹۴ فی صد قرآنی الفاظ اردو کے استعمال میں ہیں۔ ان اعداد و شمار سے اُردو زبان کے اُس طالب علم کو تحریک ملے گی جو عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے تنگ دامنی کے احساس تلے دبا ہوا تھا۔ یہ کتاب پروف خوانی کی غلطیوں سے مبرا' بک کارنر' مین بازار' جہلم کے زیر اہتمام خوبصورتی سے شائع ہوئی ہے۔

(۳)

نام کتاب : شمائل نبوی کا ایمان افروز مرقع

مؤلف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت: 153 صفحات قیمت: درج نہیں' ملنے کا پتہ: القاسم اکیڈمی' خالق آباد' ضلع نوشہرہ

شمائل ترمذی رسول اللہ ﷺ کے خصائل و شمائل پر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے' جو دینی مدارس کی درسی کتاب ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں۔ مولانا عبدالقیوم حقانی کی زیر تبصرہ کتاب شمائل نبوی کی دوسری جلد کے آخری چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے عنوان اس طرح ہیں: (۱) رسول اللہ ﷺ کے اسمائے گرامی' (۲) گزر اوقات' (۳) عمر مبارک' (۴) وفات' (۵) میراث' (۶) خواب میں زیارت۔

ہر باب کی تشریح محققانہ انداز میں اس طرح کی گئی ہے کہ عنوان کی جزئیات تک واضح ہوگئی ہیں۔ اصل کتاب تو امام ترمذیؒ کی مایہ ناز اور مقبولِ عام تصنیف ہے۔ حقانی صاحب نے شمائل ترمذی کی شایانِ شان شرح لکھ کر تشریح کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس میں علماء اور طلبہ دونوں کے لیے تسلی بخش راہنمائی کا سامان موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فضائل و شمائل پر مشتمل یہ کتاب ہر مسلمان خاندان میں موجود ہونی چاہیے۔ اس کا مطالعہ دلوں کو حب نبویؐ سے سرشار کرے گا۔

(۴)

نام کتاب : مسائلِ قربانی

مصنف : مولانا محمد عبدالمعبود

ضخامت: 230 صفحات قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: ☆ القاسم اکیڈمی' خالق آباد' ضلع نوشہرہ ☆ مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار' لاہور

قربانی ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ ہر سال پوری دنیا میں کروڑوں مسلمان ۱۰ ذوالحجہ کو اونٹ' گائے' بھیڑ' بکری کی قربانی پیش کرتے ہیں اور اس دن کو یوم النحر (قربانی کا دن) یا عیدالاضحیٰ کہتے ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ قربانی کے مسائل بیان کر دیے ہیں جن سے واقفیت حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے تاکہ قربانی کا عمل صحیح طریقے سے انجام پائے اور اجر و ثواب کا باعث بنے۔

فاضل مصنف نے قربانی کی تاریخی اور شرعی حیثیت کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نیز قربانی کے

احکام ومسائل تفصیل سے لکھ دیے ہیں۔قربانی کے ضمن میں پیش آنے والے جدید مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور راسخ العلم علماء کے دلائل سے اس ضمن میں راہِ صواب متعین کی ہے۔مشینی ذبح کی حقیقت بھی واضح کی ہے۔ قربانی کے جانور کن کن عیوب سے پاک ہونے چاہئیں اور اُن میں کون کونسی خوبیاں پسندیدہ ہیں۔گائے کی قربانی درست ہے مگر جنگلی گائے اور ہرن کی قربانی جائز نہیں۔عورت کا ذبیحہ بھی جائز ہے۔قربانی کے جانور کو کس طرح اور کب ذبح کیا جائے۔عیدالاضحیٰ کی نماز سے قبل شہروں میں قربانی جائز نہیں جبکہ دیہات کے رہنے والے فجر کی نماز کے بعد عید کی نماز سے پہلے قربانی کر سکتے ہیں۔نیز قربانی کے متعلق اس طرح کے دیگر مسائل؛ جن کا جاننا ضروری ہے؛ اس کتاب میں موجود ہیں۔تمام مسائل پوری تفصیل اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں تساہل سے کام لیا گیا ہے۔اکثر آیات کے اعراب میں غلطیاں ہیں اور کمپوزنگ کی اغلاط تو جا بجا ہیں؛ جنہیں اگلے ایڈیشن میں درست کرنا ضروری ہے۔

(۵)

نام کتاب : تذکار نواب صدیق حسن خان

مصنف : عبدالرشید عراقی

ضخامت:110 صفحات قیمت:150 روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ احیاء التراث اہل السنۃ؛ الٰہ آباد؛ وزیر آباد؛ ضلع گوجرانوالہ

علمی حلقوں میں عبدالرشید عراقی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔وہ درجنوں معیاری؛ علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔سیر وسوانح ان کا موضوع ہے۔جس شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں اُس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے مشہور محدث؛ محقق اور ثقہ عالم دین نواب صدیق حسن خان کے خاندانی پس منظر اور حالاتِ زندگی کے علاوہ اُن کی علمی؛ دینی؛ مذہبی اور قومی وملی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔نواب صاحب کے والد سید اولاد حسن بھی عالم دین تھے۔مصنف نے ان کے حالات کے علاوہ نواب صاحب کے برادرِ اکبر؛ اولاد اور اساتذہ کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔نواب صدیق حسن خان برصغیر کے نامور علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ اردو؛ فارسی اور عربی زبان کے ماہر اور علومِ اسلامیہ میں یگانہ روزگار تھے۔آپ کی تصنیفات دوسو سے زائد ہیں جن میں کئی معروف کتابوں کی شروح ہیں۔آپ کی کتابیں اکثر وبیشتر دینی موضوعات پر ہیں جن میں صحت کے ساتھ اعتدال کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ان کی سب سے مشہور کتاب ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' ہے۔یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ان کی کتب ادبِ اسلامی میں اچھا اضافہ ہے۔

کتاب میں الفاظ کی غلطیاں بے شمار ہیں جو قاری کے لیے تکدر کا باعث بنتی ہیں۔کتاب کی ضخامت کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت زیادہ رکھی گئی ہے۔

۞۞۞

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Al-Baqarah

(Ayaat 104-129)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(104) O you who believe! Say not (to the Messenger) Ra'ina but say Unzurna (Lend us an ear). And listen (to him). And for the disbelievers is a painful torment.

In this *ayah*, Allah (SWT) addresses the Muslim *Ummah* as a whole. He describes the behavior of the Jews and the hypocrites in manners of speech, and forbids the believers to behave likewise. When the Jews and the hypocrites used to meet the Prophet (SAW) and the Muslims, they would greet them with ambiguous words, which would change the meaning of the original expression. They would say to the Prophet, *'Ra'ina'*, which means 'O our shepherd [24] (May Allah's curse be upon the Jews). Similarly they used to say *'assaam-u-alaikum'* (death befall you), instead of the proper Islamic greetings of *'assalam-u-alaikum'*. Thereafter, Allah (SWT) forbade the believers to use the word *'Ra'ina'* and commanded them to say '*Unzurna'*, meaning, pay attention to us. And for those who do not obey, Allah (SWT) says, *"And for the disbelievers is a painful torment".*

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(105) Those who disbelieve from among the people of the Book and the polytheists would never wish that any good be sent down to you from your Lord; whereas Allah specifies for His special Mercy whom He wills. And Allah is the Owner of great bounty.

Allah (SWT) describes the enmity of the disbelievers towards the Muslims, whether they be from among the idolaters or from

among the People of the Book. They desire that the Muslims receive no good from Allah in the form of the guidance of the *Qur'an*. But *"Allah specifies for His special Mercy whom He wills. And Allah is the Owner of great bounty".*

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝١٠٦

(106) Whichever Ayah We abrogate or cause to be forgotten, We bring one better than it or one similar to it. Don't you know that Allah is Powerful over everything?

While the basic message of Islam has always remained the same, the legal rulings have varied through ages, and many Prophets before Muhammad (SAW) brought particular codes of law for their respective communities, which evolved gradually with the maturity of mankind. When the message of Islam was presented to the Arabs, it came as something new for them and different from their way of life. The *Qur'an* touched on a variety of subjects, including beliefs, history, stories of the Prophets, the Day of Judgment, the Paradise and the Hell, and many others, particularly the code of conduct and the legal rulings. So, to allow the people, especially the Arabs, to adjust to the new prescriptions, Allah (SWT) brought these important changes gradually, and in this process sometimes an injunction or ruling previously revealed was replaced with a new one or one similar to it. This process is known as *'An-Nasikh wal-Mansukh'*[25]. Further Allah (SWT) says, *"Don't you know that Allah is Powerful over everything"?* i.e. He can abrogate and replace whatever He wills from the *Qur'an* or from the previous Books.

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝١٠٧

(107) Don't you know that to Allah belongs the kingdom of the heavens and the earth? And you don't have, besides Allah, any protector or helper.

Allah (SWT) is the supreme authority. He alone owns the heavens and the earth, decides in them whatever He wills, forbids and repeals whatever He wills and upholds whatever He wills, and there is no protector or helper for anyone besides Him.

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝١٠٨

(108) Or do you intend to ask questions from your Messenger, as Moses was questioned before? And whoever replaces belief with disbelief has certainly lost the straight path.

The Jews constantly used to ask Prophet *Musa* (AS) foolish and unnecessary questions, just for the purpose of putting him in difficulty. Allah (SWT) criticized the Jews for their behavior and thus forbade the believers to ask unnecessary questions from the Prophet (SAW) about the matters which had not occurred till that time, or those for which Allah (SWT) had not revealed any a*yah.* However, it was told that the matters about which Allah had revealed His *ayahs* would duly be explained by His Prophet (SAW). The general instruction therefore was: "Don't ask many questions about them, for they may become a burden for you, which you would not be able to put up with". The Messenger of Allah also did not like such questions, as stated in a *Hadith*: The Prophet (SAW) was explaining to his Companions (RAA) that Allah (SWT) had ordered them to perform Hajj, when a man asked, "Every year, O' Messenger of Allah?" The Prophet (SAW) did not answer him, but he repeated his question three times. Then the Prophet (SAW) said, *"No. Had I said yes, it would have been ordained, and you would not have been able to act on it."* [26] This is why *Anas Bin Malik* (RAA) said, *"We were forbidden from asking the Messenger of Allah about things. So we were delighted when a Bedouin man would come and ask him while we listened."* [27]. Allah (SWT) says, *"And whoever replaces belief with disbelief has certainly lost the straight path"* i.e. whoever prefers disbelief to faith has strayed from the right path to the path of ignorance and misguidance.

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(109) Many among the people of the Book wish that they could somehow turn you back to disbelief after your accepting the faith, out of envy from within them, even after the truth has become quite clear to them. So forgive and overlook till Allah brings about His decision. Verily Allah is Powerful over everything.

The People of the Book recognized the virtues of the believers and their Prophet (SAW) and knew that they were on the right path, but wanted them to be deprived of the blessing of Allah (SWT) due to their selfishness. It was clear to them that Muhammad (SAW) was the Messenger of Allah (SAW), still they did not believe in him due to their selfishness and envy. Further Allah (SWT) commands Muhammad (SAW) to *"forgive and overlook"*. With the arrival of the Messenger of Allah in *Madinah*, the struggle between Islam and disbelief entered a new phase. Although the Muslims held only a tiny piece of the land, the whole of Arabia, under the leadership of the *Quraysh*[28] moved against them, so as to exterminate them. In these circumstances, the very survival, let alone the success of this small group of

believers, depended upon several factors. Firstly, they had to prepare themselves with both courage and the force of arms to resist the threat of the *Quraysh* who intended to eliminate the Islamic movement. Secondly, they had to deal with the Jews of *Madinah*. The Prophet (SAW) signed a treaty with the Jews for the time being, so that the main focus of the Muslims remained the *Quraysh* of *Makkah*. Therefore, the Messenger of Allah (SAW) used to forgive them and was patient with them, till the time when Allah (SWT) allowed the Muslims to fight.

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٠﴾

(110) And establish Salah and give Zakah, and whatever you send ahead for yourselves of good, you shall find it with Allah. Surely Allah is Watchful over whatever you do.

Allah (SWT) commands His servants to do good deeds, to establish *Salah* and give *Zakah*, which will benefit them in the life of this world and much more importantly in the Hereafter. Allah (SWT) assures that their deeds will not go in vain, because He is not unaware of the actions of anyone.

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١١١﴾

(111) And they say: "None will ever enter the Paradise except the one who is a Jew or a Christian." These are their vain desires. Say: "Produce your proof if you are truthful".

These are the false hopes of the People of the Book. They think that only they are going to enter the paradise and claim to be the children of Allah (SWT) and His loved ones, but Allah (SWT) answers them by saying, *"These are their vain desires".* Then Allah (SWT) says, *Say: "Produce your proof if you are truthful"* i.e. bring anything from your Books if Allah (SWT) really did say that you are His loved ones, and that it is only you who will enter the Paradise.

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١١٢﴾

(112) Why not! Whoever submits himself to Allah being good in deeds, for him would be the reward with his Lord; neither fear shall come upon them, nor shall they grieve.

The word '*Wajh*', translated as 'self', is a very comprehensive Arabic word. Here it means 'the whole inner self of a man'. A person who submits himself entirely to Allah (SWT), performs good deeds and is virtuous towards others, his abode will be the Paradise, and such people will have no fear or regret on the Day of Judgment.

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١١٣﴾

(113) And the Jews say: "The Christians are not on the right track," and the Christians say: "It is the Jews who are not on the right track," though they read the (same) Book! Like that said those who did not know, similar to their saying. So Allah will judge between them on the Day of Judgment concerning what they have been differing in.

Allah (SWT) explains the disputes between the People of the Book, who used to disbelieve in each other's Prophets and Books. *"Like that said those who did not know, similar to their saying".* This refers to the Arabs, who said that Muhammad (SAW) was not following anything, just like the People of the Book said to each other. So Allah (SWT) says for all of them, *"Allah will judge between them on the Day of Judgment concerning what they have been differing in".*

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۗ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١٤﴾

(114) And who is more unjust than one who prevents from the Mosques of Allah lest His name should be commemorated therein and strives for their ruin? It is not proper for such people to enter them except fearfully. For them, in the world, is disgrace, and for them, in the Hereafter, is a great torment.

The general interpretation of this *ayah* would be as it is. But specifically this *ayah* refers to the *Quraysh* of *Makkah*, who prevented the Prophet (SAW) and his Companions (RAA) from praying in *Al-Masjid-ul-Haraam* and from performing *Umrah*. *"It is not proper for such people to enter them except fearfully"* i.e. why should these idolaters be permitted to enter *Al-Masjid-ul-Haraam* when they are not its worthy guardians, hinder the people from the *Mosques* of Allah (SWT) and want to destroy them? They do not have the right to enter it except if they have fear of Allah (SWT) i.e. they embrace Islam. *"For them, in the world, is disgrace, and for them, in the Hereafter, is a great torment".* They breached the sanctity of the House, brought filth to it by placing idols, and invoked others besides Allah (SWT) in it. Therefore, there is humiliation for them in this world, and a severe torment awaits them in the Hereafter.

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾

(115) And to Allah belong the East and the West; so whithersoever you turn, there is the Face of Allah. Surely Allah is All-Embracing All-Knowing.

Prophet Muhammad (SAW) was first commanded to face *Bayt-ul-Maqdis* (*Mosque of Al-Aqsa*) in his prayers. He faced it while in *Madinah* for nearly ten months. But he would supplicate to Allah (SWT) as he liked to face the *Qiblah* of *Ibrahim* (AS) i.e. the *Ka'bah* at *Makkah*. The Jews of *Madinah* were contented at that time that the Muslims were facing their *Qiblah.* But later on, Allah (SWT) fulfilled the wish of his Messenger (SAW) and directed him to face the *Ka'bah* at *Makkah*. The Jews were disturbed by this development and used to say, "What happened to the *Qiblah* the Muslims used to face?" So Allah (SWT) mentions this *ayah* here, before the actual directive of changing the *Qiblah*, in order to assert that east or west, whether it is *Bayt-ul-Maqdis* or the *Ka'bah*, both belong to Allah (SWT) and whichever direction you face you will find the presence of Allah (SWT). *"Surely Allah is All-Embracing, AllKnowing"* i.e. His knowledge encompasses everything, and He is not unaware of the deeds of His servants.

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾

(116) And they say: "Allah has taken to Himself a son; Glory be to Him; instead, to Him belongs all that is in the heavens and the earth--all subjugated to Him.

This *ayah* refutes the Christians who believed that Jesus (AS) was Allah's son, their like among the Jews who believed that Uzair (AS) was Allah's son, and the Arab idolaters who claimed that the angels were Allah's daughters. It spells out that Allah (SWT) is too perfect to have a son, as He (SWT) is the Supreme Authority and the Creator of everything that is in the heavens and the earth, and everything therein serves Him and is obedient to Him.

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾

(117) The Originator of the heavens and the earth, and whenever He resolves a matter, He simply says to it: "Be" and it becomes.

Literally, the word *'Bid'ah'* means something new; something that never existed before. Allah (SWT) created the heavens and the earth *ex nihilo* i.e. when nothing like them existed and has complete authority and ability over all His creations. This *ayah* also alludes to the birth of *'Isa* (Jesus) (AS) as Allah (SWT) says, *"The similitude of 'Isa before Allah (SWT) is as that of Adam: He created him from dust then said to him: "Be" and he was."* [29] Thus Allah (SWT) informs that He created Jesus (AS) just as he created everything in the universe, refuting the claims of the Christians of his being Allah's son.

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۱۱۸

(118) And those who do not know ask: "Why does Allah not speak to us or a sign come to us?" Like that said those before them similar to their saying. Their hearts are alike. No doubt, We have already made the signs clear for a people who have conviction.

This *ayah* refers to the Arab idolaters who demanded that Allah (SWT) should speak to them directly or show them an extraordinary sign that would convince them that Muhammad (SAW) was the Messenger of Allah. But Allah (SWT) remarks on this attitude of theirs by saying: *"Like that said those before them similar to their saying"* i.e. these misguided people do not demand something new; these demands and objections have been raised over and over again. Whenever Allah (SWT) sent a Messenger to a people, they demanded a sign to be shown. So Allah (SWT) says, *"Their hearts are alike"*, meaning, what these idolaters demand is the same as what the misguided people in the past used to demand. *"No doubt We have already made the signs clear for a people who have conviction"* i.e. We have already vindicated the truth of our Messengers and the objections raised have already been dealt with.

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝۱۱۹

(119) Verily We have sent you (O' Muhammad) with the truth as a bearer of glad tidings and a warner. And you will not be questioned about the companions of the Blazing Fire.

Allah (SWT) has sent Muhammad (SAW) as a witness, an announcer of good news to the believers and a warner for all those who disbelieve in Allah's *ayaat*, but he (SAW) will not be held responsible for the disbelief of the people, as his duty was just to convey the message properly and in the right earnest.

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۱۲۰

(120) And the Jews will never be pleased with you, nor will the Christians unless you follow their faith.Say: "Indeed Allah's guidance is the actual guidance". And if you ever follow their desires after that which has come to you of the knowledge, you will have, from Allah, neither any protector nor any helper.

Allah (SWT), addressing His Messenger, says that the Jews and the Christians will never be pleased with him until he follows their practices and beliefs. They had themselves distorted the words of Allah (SWT) and the real cause of their discontent was that he (SAW)

did not resort to hypocrisy and corruption in the religious matters like them and instead stuck to what pleases Allah (SWT) and fulfilled His commandments. Therefore, they, instead of following the Prophet (SAW), wished that he (SAW) and the Muslims would follow them. Allah (SWT) orders His Messenger to tell them that the guidance that Allah (SWT) has sent to Muhammad (SAW) is the true guidance, and Islam is the perfect religion. *"And if you ever follow their desires after that which has come to you of the knowledge, you will have, from Allah, neither any protector nor any helper."*

Although this *ayah* apparently addresses Prophet Muhammad (SAW), its ruling in fact applies to his entire *Ummah*, and it is a warning for them not to imitate the ways and methods of the Jews and the Christians.

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

(121) Those to whom We have given the book, recite it fulfilling all the requirements of its recitation; those are the people who actually believe therein. Whereas whoever disbelieves therein, those are the actual losers.

The Arabic word '*Tilawah*' has two meanings; *'to recite'* and *'to follow'* [30]. So this *ayah* mean that those among the people of the Book who adhered to the Books Allah (SWT) revealed to His Prophets and followed what was therein, will believe in Muhammad (SAW) and what has been revealed to him i.e. the *Qur'an*. *"Whereas whoever disbelieves therein, those are the actual losers"* i.e. those who reject the Messenger and the message he has brought, their abode will be the Hellfire, as the Prophet (SAW) said: *"By Him in whose hand is my soul! There is no member of this Ummah, Jew or a Christian, who hears of me, yet does not believe in me—but will enter the fire"* [31].

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

(122) O Children of Israel! Remember My blessing which I bestowed upon you and that I preferred you over (the nations of) the worlds.

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(123) And guard yourselves against a day when no soul shall avail another in the least, neither any compensation will be accepted therefrom, nor intercession will profit it, nor shall they be helped.

These two *ayaat* are a repetition of *ayaat* 47 and 48 (except for a slight variation, which does not affect the sense), and thus the argument of the favors on the *Children of Israel* discussed in between these *ayat* is beautifully rounded off in a bracket.

The next four sections discuss the shifting of the *Qiblah* from *Jerusalem* to the *Ka'bah* in *Makkah* and thus the favor Allah (SWT) bestowed upon the Arabs in succeeding to the spiritual inheritance of *Ibrahim* (AS).

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

(124) And when the Lord of Ibrahim tested him with certain commands, so he fulfilled them. Allah said: "Surely I am going to appoint you, for the mankind, a leader". Abraham asked: "And from among my offspring (too)?" Allah said, "My promise will not reach the unjust."

This *ayah* invites the idolaters and the People of the Book who pretend to be the followers of *Ibrahim* (Abraham) (AS) to ponder upon the fact that in reality they do not follow him. Allah (SWT) reminds them of the trials that He put *Ibrahim* (AS) into. He (AS) was truthful and obedient to Allah's commands, sacrificed everything that is valued in life, and encountered every kind of danger in the way of the truth, with steadfastness. When *Ibrahim* (AS) proved his loyalty towards his Lord in all these trials, Allah (SWT) exalted him to the status of *Imaam-un-Naas* (the leader of mankind) and made him a role model for all mankind to follow. At this, he prayed to his Lord that the leaders thereafter be chosen from his offspring. This supplication of his was accepted[32] but Allah *said, "My promise will not reach the unjust."* i.e. Allah's promise of the leadership within *Ibrahim's* progeny is limited to those of his descendents who are righteous, and the unjust people from his offspring will not deserve His promised grace.

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

(125) And when We made the House a place of assembly for mankind and a place of safety; and take from the station (Maqam) of Ibrahim a place of prayer.

And We entrusted Ibrahim and Ismail that you both purify My House for those who circumambulate, stay in seclusion, bow down and prostrate (in prayers).

Allah (SWT) honored the Sacred House and made it a safe place for all those who visit it. Most scholars are of the opinion that *Maqam* is the stone of *Ibrahim* (AS) which he was standing on while building the *Ka'bah*. As its walls became higher, *Ibrahim* (AS) could not reach them, whereupon his son *Ismail* (AS) brought a stone on which he could stand and place the stones on the wall. This *Maqam* is still marked near the *Ka'bah* and everyone performing the Pilgrimage prays next to this stone after finishing the *Tawaf*

(circumambulation) of the *Ka'bah*. *"And We entrusted Ibrahim and Ismail that you both purify My House for those who circumambulate, stay in seclusion, bow down and prostrate (in prayers)".*

The purification of the House was not only cleansing it from physical impurity but also from the false beliefs and filth of associating partners with Allah (SWT).

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

(126) And when Ibrahim said: "My Lord! Make this a peaceful city, and provide its residents out of the fruits – those of them who believe in Allah and the Last Day. Allah said: "And whoever disbelieves, I shall make him enjoy a little & for a while, then I will compel him towards the torment of the Fire, and that is an evil destination.

Ibrahim (AS) prayed to his Lord to make the city of *Makkah* a place of security and to grant sustenance therein for the believers. He excluded the transgressors and the unjust people from this prayer because of the assertion of Allah (SWT) that His promise will not be for the evildoers. But Allah (SWT) removes his misunderstanding that while the leadership will be bestowed upon the righteous only, the means of livelihood will be given to both the believers and the disbelievers. However, this is only for an appointed time in this terrestrial existence and then the disbelievers will be the inmates of the Hellfire forever.

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

(127) And when Ibrahim was raising the foundations of the House alongwith Ishmael (praying): "O our Lord! Accept (this) from us; surely You, and You alone, are the All-Hearing, the All-Knowing".

Ibrahim (AS) and Ismail (AS), while doing a very virtuous act, did not become self-righteous; instead, they prayed to their Lord to accept this from them. This is the attitude and modesty of a true believer; even when doing a good deed, he fears Allah (SWT) and is concerned about its acceptance by Allah (SWT).

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

(128) Our Lord! And make us both Muslims (submissive) to You and out of our progeny a nation submissive to You. And show us our rites of worship and turn to us in Mercy. Surely You, and You alone are the Oft-Returning, the Ever-Merciful.

The Arabic word used in this *ayah* is '*Muslim'* i.e. one who submits himself to the will of Allah (SWT). A Muslim is one who surrenders himself totally to Allah, obeys all His commands and does not associate anyone or anything with Him. *Ibrahim* (AS) supplicated to his Lord to make him and his son *Ismail* (AS) Muslims and to raise a nation out of their progeny, who would be Muslims i.e. submissive and obedient to Him. He also asked Allah (SWT) to show them the ways and rituals through which they could worship Him. A Hadith[33] states that when *Ibrahim* (AS) supplicated, angel *Jibreel* (AS) came down and showed him the rituals of worship. He also showed the foundations of the Sacred House, where Prophet *Ibrahim* (AS) and his son raised the walls of the House.

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

(129) O our Lord! And raise amongst them a Messenger out of them, who shall recite unto them Your Ayaat and teach them the Book and the wisdom, and purify them. Verily You and You alone are the All-Mighty, the All-Wise.

Ibrahim (AS) invoked Allah (SWT) to send a Messenger from his offspring *"who shall recite unto them Your Ayaat and teach them the Book"*. This invocation of his was materialized in the form of the *Qur'an* revealed to Prophet Muhammad (SAWS). *"And the wisdom"*; some exegetes believe that it is the '*sunnah'* of the Prophet (SAWS), while others opine that it means 'deep understanding and comprehension of the religion'. In fact, both meanings are correct. *"And purify them"* i.e. purify their lives of every kind of sin.

Endnotes

[24] *Ra'eena* means O' our shepherd, It is also an evil remark in Hebrew Language. The Jews used the expression as a derisive pun.

[25] The Arabic words '*nasikh*' and '*mansukh*' are both derived from the same root word '*nasakha*' which carries meanings such as 'to abolish, to replace, to withdraw, to abrogate'. The word *nasikh* (an active participle) means 'the abrogating', while *mansukh* (passive) means 'the abrogated'. In technical language these terms refer to certain parts of the *Qur'anic* revelation, which have been 'abrogated' by others. Naturally the abrogated passage is the one called '*mansukh*' while the abrogating one is called '*nasikh*'.

[26] Sahih Muslim, 2: 975.

[27] Sahih Muslim, 1: 41.

[28] Quraysh were the descendants of Fahr bin Malik bin An-Nadr bin Kinana. They branched out into various tribes, the most famous of whom were Jumah, Sahm, 'Adi, Makhzum, Tayim, Zahra and the three septs of Qusai bin Kilab: 'Abdud-Dar bin Qusai, Asad bin 'Abdul 'Uzza

bin Qusai and 'Abd Manaf bin Qusai. Prophet Muhammad (SAW) said: "Allah selected Ishmael from the sons of Abraham, Kinana from the sons of Ishmael, Quraysh from the sons of Kinana, Hashim from the sons of Quraysh and He selected me from the sons of Hashim."

[29] Surah Aal-e-Imran (3): 59.

[30] Tilawah has two meanings 'to recite' as in the ayah *"O' Lord, appoint from among them a Prophet who shall* ***recite*** *to them Your Revelations.."* (2:129) and it also means 'to follow' as in surah As-Shams where Allah (SWT) says: *"By the Moon as she* ***follow*** *him"*.91:2

[31] Sahih Muslim 1:134.

[32] Surah Al-'Ankabut (29) : 27.

[33] Said bin Mansur, 2:615.

γ γ γ